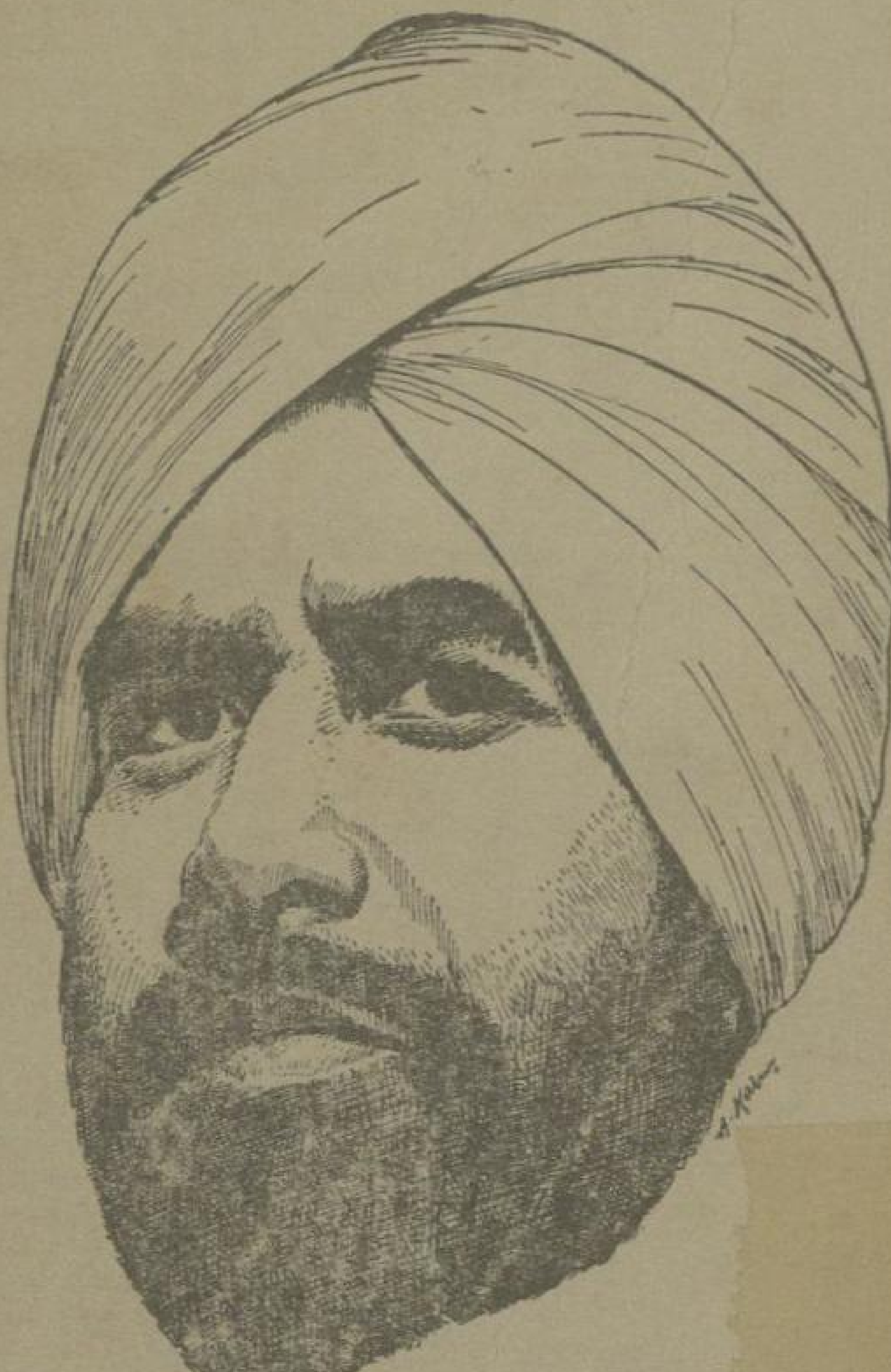
کُندن



راجندر سنگھ بیدی

کندن

راجندر سنگھ بیدی کی دیگر تصانیف

۱۔ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
۲۔ بے جان چیزیں
۳۔ بیدی کے افسانے
۴۔ چلتے پھرتے چہرے
۵۔ سات کھیل

کُندن

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ اُردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— -/۱۰ روپے

فہرست

راجہ اور راجندر

راجندر سنگھ بیدی صاحب کا نام شاید آپ نے سُنا ہو گا، نہیں بھی سُنا
تو کوئی ہرج نہیں، آخر اس میں شرمانے کی کیا بات ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ
اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، سب قصور بیدی صاحب کا ہے جو ابھی تک پورے ملک
سے اپنے آپ کو متعارف نہ کرا سکے، اور اب کیا متعارف کرائیں گے،

کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ لڑکے! ان حرکتوں سے باز آ جا، اور کچھ کر، نہیں تو
ایک دن گمنامی کی موت مر جائے گا، لیکن دنیائے ناپائیدار میں نام پیدا کرنے کا کیا فائدہ
دوسری دنیا میں نام پیدا کرنا چاہیئے دنیا کا چمن تو یونہی رہے گا، اور ہزاروں جانور اپنی
اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے ؎

دو دن کر لے غٹرغوں غوں دنیا کبوتر خانہ ہے
تھوڑا ہنسنا تھوڑا رونا پھر اوپر اڑ جانا ہے

صاحب! افسانوں اور افسانوں کے خود ساختہ کرداروں سے زیادہ اہم وہ کردار
ہیں جو خدا نے زندگی کے اسٹیج پر ان کی جیب میں کچھ پیسے ڈالے بغیر بھیج دیئے ہیں،
ہمیں رازقِ مطلق کا حق ادا کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ان کی جیب میں کچھ نہ کچھ ڈالتے رہنا
چاہیئے:

آپ اب ازراہ کرم و ادب نوازی، افسانہ نگاری کے مسئلے پر تھوڑی دیر

کے لئے لعنت بھیج دیجئے اور بیدی صاحب سے ملئے۔

بیدی صاحب ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں مقبول ہوں نہ ہوں ملک کے ایک خاص طبقے میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہیں، سچ پوچھئے تو یہ خاص طبقہ شاعروں اور ادیبوں کے طبقے سے بدرجہا زیادہ اہم اور خوشحال ہے اور اس کی خوشحالی اور اہمیت کے زیادہ تر ذمہ دار خود بیدی صاحب ہیں اور جب تک زندہ ہیں (خدا انہیں عمر خضر عطا فرمائے) اس طبقے کے لاکھوں افراد کبھی بھوکے نہ مر سکیں گے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر ملک کا وہ کون سا طبقہ ہے جس کے بیدی صاحب دلوانے ہیں، کانگریسی؟ نہیں۔ مہاسبھائی؟ نہیں جن سنگھی؟ نہیں، نیشنلسٹ؟ نہیں، ہو چکی؟ نہیں چلیے اب میں آپ کو زیادہ زحمت انتظار نہیں دوں گا۔

آپ لوگ یہ سن کر شاید خوش ہی ہوں گے کہ بیدی صاحب کی یہ محبوب جماعت ملک کے لچوں، لفنگوں، بیکاروں اور نجموں کا عظیم الشان طبقہ ہے۔ بیدی صاحب کے تمام دوست اور دشمن اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید یہ خاکسار بھی بیدی صاحب کے.... متعلق کچھ کہنے پر میں نے کمر ہمت تو باندھ لی ہے مگر سوچتا ہوں کہ ان کے متعلق کیا بتاؤں کیا نہ بتاؤں، سچ پوچھئے تو بیدی صاحب کا دوست ہونے کے باوجود میں ان کی عظمتوں سے کماحقہ واقف نہیں قلم بار بار کچھ سوچ کر رک جاتا ہے، سمجھ لیجئے کہ مجھے اتنا معلوم ہے کہ کئی دوسرے بڑے کام کرنے کے علاوہ افسانے بھی لکھتے ہیں، ان کا ایک افسانہ "ایک چادر میلی سی" سائبیریا میں بہت پاپولر ہوا تھا جونہی یہ افسانہ سائبیرین زبان میں منتقل ہوا۔ اہل سائبیریا میں سنسنی پھیل گئی اور انہوں نے

اپنے ریڈروں کی دموں پر انگلی رکھ کر قسم کھائی کہ آئندہ ہم کبھی اپنی میلی چادریں نہ دھوئیں گے صرف اسی افسانے کو پڑھا کریں گے اور کرشن چندر کا کوئی افسانہ سائبیرین زبان میں منتقل نہ ہونے دیں گے۔

پچھلے دنوں ایک روسی ادیب بیدی صاحب سے انٹرویو لینے آیا تو اس نے علاوہ دوسرے سوالوں کے ایک سوال یہ بھی پوچھا کہ مسٹر بیدی! آپ نے صاف دل اور صاف باطن ہونے کے باوجود اپنے اس افسانے کا نام "ایک چادر اجلی سی" کے بجائے "ایک چادر میلی سی" کیوں رکھا؟"

بیدی صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ "موسیو! ہندوستان کے زیادہ تر لوگ غریب ہیں، ان کے پاس کپڑے دھونے کے لئے صابن نہیں ہوتا، ان کی دل شکنی کا امکان تھا، اس لئے میں نے افسانے کا نام "ایک چادر میلی سی" رکھنا مناسب سمجھا۔ جب ہندوستان خوشحال ہو جائے گا تو آنے والی نسلیں خود میرے افسانے کا نام بدل دیں گی"۔ یہ کہہ کر بیدی صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔

بیدی صاحب کی حالت دیکھ کر اور ان کا درویشانہ جواب سن کر انٹرویو لینے والے پر بھی رقت اور وحشت کا دورہ پڑ گیا، اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور اپنے سر میں بہت سی خاک اور کپڑوں پر بہت سی راکھ مل لی۔ اپنا سوٹ اپنی ٹائی، اپنا بوٹ ایک غریب کمیونسٹ مزدور کو پیش کر کے بیدی صاحب کی ایک چڈی پہن لی بیدی صاحب نے بڑھ کر اسے گلے لگایا، دونوں کمیونسٹ دوست ایک دوسرے سے ہمکنار ہو کر کئی گھنٹوں تک زار زار روتے رہے اس کے بعد یکایک کمیونسٹ دوست "ڈرکرز" کا نعرہ لگا کر اٹھا اور چڈی سمیت روس کی سرزمین کو پیدل

بھاگ گیا،

بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانیے کیا یاد آیا،

بحیثیت دوست مجھے راجندر سنگھ بیدی صاحب کے بارے میں صرف ایک ہی بات قطعی طور پر معلوم ہے وہ یہ کہ بیدی صاحب بہت سی قابل اعتراض خوبیوں کے مالک ہیں، ان خوبیوں کو بعض لوگ صریحاً خرابیاں بھی کہہ سکتے ہیں یہ اپنا اپنا ذوق ہے اور بھارت کی سیکولر حکومت میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جیسی چاہے خوبیاں یا خرابیاں اپنے اندر پیدا کرے،

بیدی صاحب بعض لوگوں کے نزدیک خوش قسمتی سے اور بعض لوگوں کے نزدیک بدقسمتی سے بڑے ہی بدقسمت واقع ہوئے ہیں، بدقسمتی کا نام انہوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے "خوش قسمتی" رکھ لیا ہے اور یہ بھی کوئی بری بات نہیں،

بیدی صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "اس لحاظ سے میں بڑا ہی خوش قسمت ہوں کہ میرا کوئی دوست یا دشمن ایسا نہیں جو کم از کم پانچ سال تک میرے یہاں مہمان نہ رہا ہو۔ ان کے دوست بظاہر سوٹ پہننے والے ٹائی لگانے والے، تعلیم یافتہ انسان ہیں مگر باطن کوئی موچی ہے کوئی چمار ہے اور کوئی لوہار، میرا مقصد خدانخواستہ کسی پیشے کی تذلیل کرنا نہیں، شاعری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی بھی تو کچھ ایسے ہی پیشے ہیں۔

میرا مطلب صرف یہ ہے کہ بیدی صاحب کے ان بے شمار پیارے دوستوں کی مہمان نوازی، مستقل رہائش، کھانے پینے اور جیب خرچ کا انتظام بھی بیدی صاحب کے ذمے ہے۔ میں خود بھی سات آٹھ سال بیدی صاحب کا مستقل مہمان

رہ چکا ہوں۔

بیدی صاحب کے یہاں کوئی مہمان زیادہ سے زیادہ پانچ سال تک رہ سکتا ہے، اگر پھر بھی ازراہِ محبت ان کا دامن نہ چھوڑنا چاہے تو بیدی صاحب اسے نیا مکان کرائے پر لے دیتے ہیں اور ہر ماہ اسے خرچ کے لئے ایک خاص رقم پہنچا دی جاتی ہے جسے عموماً پنشن کہا جاتا ہے۔

بیدی صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ لفظ "نہیں" گنگا کی لغت میں لکھا ہے، چنانچہ اہلِ کمال اس کے اس اصول سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی عمر بھر کے لئے ان کا مہمان بن جاتا ہے، کوئی کہتا ہے "میں مہمان بن کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا میرا حصہ ہر ماہ فلاں شہر، فلاں پتے پر بھیج دیا کیجیے" کوئی ان کی جیبوں کی تلاشی لے کر آنے پائیاں تک نکال لے جاتا ہے۔ کوئی ان کی بنک کی پاس بک نکال کر سادہ چیک پر ان سے دستخط کرا کے رقم خود بھر لیتا ہے وہ کسی سے "نہیں" نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ سردار راجندر سنگھ بیدی کے بجائے بعض لوگ انہیں سردار مروت سنگھ بیدی بھی کہتے ہیں

بیدی صاحب جن دنوں بہت قلاش ہوتے ہیں اور ان کا کوئی دوست یا دشمن اپنے گھر کے دردناک حالات سنا کر اس سے رحم کا طالب ہوتا ہے تو وہ تب بھی اسے اپنے در سے ناکام نہیں لوٹاتے۔ کہیں سے ہزار دو ہزار روپیہ قرض لے کر اس کے حوالے کر دیتے ہیں، ساتھ ہاتھ جوڑ جوڑ کر اس سے معذرت بھی کرتے ہیں کہ بڑی کوشش کی مگر دو ہزار سے زیادہ رقم کہیں سے نہ مل سکی۔ اگر مانگنے والے کی بات پر انہیں بہت ہی رحم آجائے تو روپیہ دینے کے بعد اظہارِ افسوس کے طور پر اس

سے گلے مل مل کر خوب رو بھی لیتے ہیں، اکثر رو رو کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور قرض لینے والا پیسے جیب میں ڈال کر انہیں اسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر چمپت ہو جاتا ہے۔

بیدی صاحب کے گھر میں جب مہمان دوستوں یا مہمان عزیزوں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ بال بچوں سمیت یا تو بھوکے رہتے ہیں یا بھیک مانگ کر گزارا کرتے ہیں، اب اتنا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرے۔

راجندر سنگھ بیدی صاحب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ایک کھاتے پیتے آدمی ہیں، مشہور ہے شاید وہ ہوں گے لیکن انہیں کھاتے یا پیتے میں نے کبھی نہیں دیکھا، البتہ ان کے مہمانوں کو دن میں پانچ چھ مرتبہ کھاتے پیتے ضرور دیکھا ہے۔ وہ چھپ چھپ کر کھاتے یا پیتے ہوں تو دوسری بات ہے۔

بیدی صاحب کا گھرانہ بڑا پیارا گھرانہ ہے۔ ان کی ایک بچی تو بہت چھوٹی ہے جو شاید تعلیم حاصل کرتی ہے۔ بڑی بچی کی شادی کر دی گئی ہے۔ مسز بیدی ابھی اس بچی کی شادی کی مخالف تھیں وہ اسے مزید تعلیم دلانا چاہتی تھیں، لیکن ایک دن بیٹھے بیٹھے جانے بیدی صاحب کو کیا خیال آیا کہ اس بچی کی شادی کے درپے ہو گئے، کہنے لگے، مجھے خیال آیا ہے کہ اس بچی کی شادی کر دینا ضروری ہو گیا ہے، اگر اس کی شادی ہو جائے تو اس کے حصے کا کھانا اور کپڑا کسی غریب بچی کو مل سکتا ہے، ایشیا کی ہر بچی میری اپنی بچی ہے۔ اس بچی کو میں نے کافی لکھا پڑھا دیا ہے، پالا پوسا ہے۔ وہ اپنا حق لے چکی ہے اب دوسروں کی باری ہے چنانچہ اس بچی کی شادی کر دی گئی۔ ان کی

دوسری بچی دعائیں مانگتی رہتی ہے کہ "اے خدا مجھے بہت جلدی بڑا نہ کر دینا ورنہ ڈیڈی مجھے بھی گھر سے نکال دیں گے۔

بیدی صاحب کے دو صاحبزادے ہیں، ایک ہوبہو سردار راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اس بچے میں اور ایک گلاب میں کوئی فرق نہیں بڑا ہی پیارا اور معصوم ہے۔ بیدی صاحب نے اسے ایک کمرے میں مقفل رکھ کر پالا ہے یہ بچہ ماڈرن دنیا اور اس کے لوازم سے بالکل بے خبر ہے۔ اس بچے نے جواب تک ماشاء اللہ جوان بھی ہو گیا ہے، نہ ہوائی جہاز دیکھا ہے، نہ ٹرینیں نہ بسیں نہ کرشن چندر، ایک مرتبہ بیدی صاحب صبح صبح اسے سیر کرانے لے گئے تو راستے میں ایک مرغا نظر پڑا بدقسمتی سے مرغے نے اذان دیدی، برخوردار ڈر کر بیدی صاحب سے چمٹ گیا، اور کہنے لگا "ڈیڈی یہ کون صاحب ہیں؟ اور اتنے زور زور سے کیوں رو رہے ہیں؟ کیا انہیں بھی پیسے کی ضرورت ہے۔

بیدی صاحب بغیر جواب دیئے جلدی سے اسے گھر گھسیٹ لائے، اور اس کو اس کمرے میں مقفل کر دیا جس میں اس بچے نے اپنے بچپن کے بہت سے دن گزارے تھے کہ اسے زمانے کی ہوا نہ لگ جائے، نوبت بایں جا رسید کہ اس لڑکے نے ایک دن اپنے گھر کے قید خانے کی کھڑکی سے ہاتھی گزرتے دیکھ لیا تو بیچارہ وہیں بے ہوش ہو گیا کہ جانے کیا چیز ہے۔

بیدی صاحب کے دوستوں کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے بیدی صاحب کے قدموں پر سر رکھ کر اسے "قید خانے" سے نجات دلائی اور کئی دن کے بحث مباحثے کے بعد بیدی صاحب کو قائل کر دیا کہ اس بچے کے بیسے

اسکول جا کر تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے، بیدی صاحب نے اس شرط پر لڑکے کو سکول جانے کی اجازت دے دی کہ وہ برقع پہن کر ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول جائے اور برقع پہن کر واپس آئے۔

بیدی صاحب کا دوسرا لڑکا بیس بائیس سال کا دبلا پتلا ہونہار جوان ہے۔ بیدی صاحب نے اسے بھی قید خانے ہی میں پالنے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکا بے حد ذہین اور چالاک تھا، منہ پھٹ اور آنکھوں میں ذہانت کی ایسی چمک کہ اندھیرے میں آنکھیں کھول دے تو تاریکیاں جگمگا اٹھیں۔ وہ بیدی صاحب کے "قید خانے" میں زیادہ دن نہ رہ سکا۔ ایک دن کمرے کی کھڑکی کی سلاخیں توڑ کر نکل بھاگا۔ اس لڑکے کا نام سردار نریندر سنگھ بیدی ہے۔ سردار نریندر سنگھ سلمہ نے رات کے ۱/۲ ۹ بجے کے قریب قید خانے سے فرار ہو کر سب سے پہلے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں پناہ لی۔ ایک گھنٹہ بعد جب وہ سیلون سے باہر نکلا تو نہ وہ "سردار" رہا تھا نہ "سنگھ" صرف نریندر بیدی ہو کر رہ گیا تھا۔ نریندر فارغ البال ہو کر رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا، گھر کی دیوار پھاند کر صحن میں کودا، وہاں سے شرم کے مارے منہ چھپاتا ہوا دوڑ کر خواب گاہ میں پہنچا ہی تھا کہ گھر کے لوگوں نے اسے دیکھ لیا۔ نریندر کو کلین شیو اور کلین ہیڈیڈ دیکھ کر گھر کے کسی فرد نے نہ پہچانا گھر کے سب لوگ ہاتھوں میں لکڑیاں لے کر چور چور کہتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس نے بہترا شور مچایا کہ میں چور نہیں ہوں سردار نریندر سنگھ بیدی ہوں مگر کسی نے اس کی ایک نہ مانی۔ سب چلا چلا کر کہنے لگے "کیا سردار نریندر سنگھ بیدی ایسا ہوتا ہے؟" اور بیدی صاحب بولے ـــ

"چہ دلاور است وزدے کہ بکف چراغ دارد"

ایک تو چوری کی نیت سے گھر میں کودا، دوسرے کلین شیلون ہو کر اپنے آپ کو سردار کہہ رہا ہے، چار سو بیس کہیں کا۔"

چنانچہ گھر کے سب لوگوں نے اسے نہ پہچانتے ہوئے پولیس اسٹیشن بھیج دیا، لڑکا ذہین اور چالاک تھا اس نے فوراً پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں کیرالا ہیر کٹنگ سیلون میں جا کر فارغ البال ہو گیا ہوں، گھر کے لوگوں نے نہیں پہچانا اور بیدی صاحب چور سمجھ کر مجھے پولیس سٹیشن میں ڈپارٹ کرا گئے ہیں، ہزاروں چوروں، ڈاکوؤں کو گھر میں پناہ دیتے ہیں اور چونکہ میں گھر کا چور تھا، اس لئے انہوں نے مجھ پر لنکا ڈھانی ضروری سمجھی اور میرے لئے سب سے مناسب جگہ پولیس اسٹیشن ہی سمجھ بیٹھے، خدا کے لئے آکر میری جان چھڑائیے میں فوراً پولیس اسٹیشن پہنچا، ایک لمحے کے لیے میں بھی نریندر کو نہ پہچان سکا۔ اس وقت پہچانا جب وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

میں نے اپنے چہرے پر غصے کے نقلی تاثرات پیدا کرتے ہوئے اسے خوب ڈانٹا اور پھٹکارا، اور کہا: شرم نہیں آتی ایک تو اتنی بری حرکت کر بیٹھے ہو، دوسرے ڈھٹائی سے اب ہنس بھی رہے ہو۔"

وہ ہنس کر بولا" انکل! میں خوب سمجھتا ہوں، آپ اندر سے خوش اور باہر سے ناراض ہو رہے ہیں، میں انڈین مسلز کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

کچھ نہیں! کہہ کر میں نے اس کی ضمانت دی اور چھڑا لیا۔ اسے اس کے گھر لے چلا تو وہ بولا۔ انکل! آج رات تو میں آپ ہی کے گھر رہوں گا۔

کل صبح دونوں ساتھ چلیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کے اندھیرے میں میرے ساتھ آپ بھی پٹ جائیں،

دوسرے دن میں نریندر کو اس کے گھر پہنچا آیا۔ اب نریندر بیدی پر گھر کے لوگوں نے خاندان والوں نے اور سوسائٹی نے جو جو ستم کئے اور مبارکباد کے جو جو خوبصورت ہار پہنائے اس کی تفصیل نریندر ہی سے پوچھئے۔ نہ پوچھیں تو اور بھی اچھا ہے، سماج کے معاملات میں زیادہ دخل دینا اچھا نہیں ہوتا،

نریندر ایک ذہین، عقلمند، ہوشیار اور عملی جوان ہے، منہ پھٹ اور صاف گو۔ بیدی صاحب نے اس کا نام مرکھنا بیل رکھا ہے، وہ اسے ہر وقت غیر مناسب ٹائپ کی نصیحتیں کرتے رہتے ہیں، قسمیں کھا کھا کر اسے دنیا کے غیر فانی ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں، نریندر جواب دیتا ہے کہ "ڈیڈی! اول تو دنیا فانی ہی نہیں ہے، سب پرانے ڈھکوسلے ہیں، اگر وومنٹ کے لئے مان بھی لیا جائے کہ دنیا فانی ہے، تو پھر مجھ کو اور آپ کو اس کی ہر نعمت سے جلد از جلد محظوظ ہو لینا چاہیے

ے
زاں بیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

سب چوروں اور ڈاکوؤں کو آپ اپنی شرافت کی قید سے رہائی دے دیجیے، ہماری گورنمنٹ نے ان سب کے لیے ہزاروں جیلیں کھول رکھی ہیں، کیوں نہ ہم انہیں وہاں بھیج کر امن اور چین کی زندگی بسر کریں، آخر آپ نے نیک اعمال کر کے روحوں کی بے چینی اور درد و کرب کے سوا کیا حاصل کیا ہے، اگر کوروؤں اور پانڈوؤں کے زمانے میں آپ ہوتے تو جنگ مہابھارت نہ ہوتی، اور اگر جنگ مہابھارت نہ ہوتی تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا، اس کا جواب دنیا بھر کے دانشوروں

سے جاکر پوچھ لیجئے ۔ میں کوئی عقلمندی کی بات کروں گا تو آپ اسے بیوقوفی سمجھیں گے محض اس لئے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں ، اگر یہی باتیں ہریش چندر ، بکرماجیت یا مہاراجہ اشوک یا مسٹر کینیڈی یا مسٹر خروشچیف آپ سے کہتے تو آپ ان کے پاؤں پکڑ لیتے میں نہیں کہتا کہ میری باتیں سن کر آپ میرے چرن چھوئیں ، آپ میرے بزرگ ہیں ، بہر حال کم از کم میری عقلمندی کی داد تو دیجئے ۔ اب اپنی زندگی مصیبتوں کے بھنور میں ڈال کر آپ مجھ سے کیوں کہتے ہیں کہ ۔

ہم تو ڈوبے ہیں میاں تم کو بھی لے ڈوبیں گے

میں نہیں ڈوبوں گا ، نہیں ڈوبوں گا ، نہیں ڈوبوں گا اور اگر ڈوبوں گا تو آپ کے ساتھ نہیں ، اپنا اپنا سمندر ، اپنی اپنی موت ۔"

اس قسم کی بے باکانہ اور گستاخانہ تقریریں سن کر بیچارے بیدی صاحب آہ بھر کر خاموش ہو جاتے ہیں ، وہ سمجھتے ہیں کہ نریندر پاگل ہو گیا ہے اور ایک مرتبہ انہوں نے تھانہ پاگل خانہ کے انچارج کو ٹیلیفون کر کے کچھ باتیں بھی کی تھیں ، پاگل خانے کا انچارج اتنا بے وقوف تھا کہ نریندر کے بجائے انہیں لینے کے لیے آ پہنچا ۔

بیدی صاحب بانئ نریندر کی حالت پر سولہ سولہ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے امید تھی کہ میرا بیٹا نیکی اور شرافت میں مجھے بھی مات دے دے گا ، لیکن افسوس کہ یہ تو دنیادار نکلا ، میری تمنا تھی کہ میں اسے گیروے کپڑے پہنا کر کسی تیرتھ استھان بھیج دوں گا جہاں وہ اپنی باقی عمر عبادت اور خلقِ خدا کی خدمت میں گزار دے لیکن یہ تو دنیادار غنڈہ نکلا ، یہ تو فلمیں بنانا چاہتا ہے بیدی صاحب کو اگر دنیا میں کوئی دکھ ہے تو یہی ہے ، ویسے انہیں اس قسم کے ہزاروں اور بھی دکھ ہیں لیکن ، ان

دکھوں کا نام تو انہوں نے سکھ رکھ دیا ہے، عزیزم نریندر کا اصرار ہے کہ بیدی صاحب اس کے دکھ کو بھی سمجھ لیں،

بیدی صاحب کے گھر کا سب سے اہم فرد ان کی بیگم ہیں جنہیں بیدی صاحب نے زبردستی تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ سردار راجندر سنگھ بیدی بنا لیا ہے بہت سے نوکروں کی موجودگی کے باوجود وہ خود کھانا پکاتی ہیں، گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی وہ خود ہی انجام دے لیتی ہیں، نوکروں سے مہینے میں شاید ایک آدھ معمولی سا کام لے لیا جاتا ہے کیونکہ بیدی صاحب کا حکم ہے کہ "نوکروں کو زیادہ پریشان نہ کیا جائے ممکن ہے ان میں سے کوئی ولی اللہ ہو۔

بیدی صاحب مساوات کے شدت سے قائل ہیں، صبح شام کھانا وہ اپنے تین نوکروں اور آیا کے ساتھ ایک خوبصورت میز پر کھاتے ہیں، مسز بیدی سالن کی پلیٹیں رکھنے کے بعد گرم گرم چپاتیاں میز پر لاتی جاتی ہیں اور یہ لوگ مزے سے کھاتے جاتے ہیں لیکن یہ نارمل دنوں کی بات ہے لیکن جب گھر میں مہمانوں کی بھرمار ہو جاتی ہے، تو بیدی صاحب کو کھانا نہیں دیا جاتا، بیدی صاحب کا یہی حکم ہے کہ ان کے حصے کا کھانا مہمانوں کو کھلا دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کھانا کم پڑ جانے کی وجہ سے کوئی مہمان بھوکا رہ جائے اور انہیں بددعا دے بیٹھے، ایسے موقعے پر وہ خود اپنے پیٹ پر بلیں پیر کا پتھر باندھ کر سو جاتے ہیں جو پاکستان سے بھاگتے وقت وہ اپنے مکان سے اٹھا لائے تھے،

جب گھر میں بدتمیز مہمان عین کھانے کے وقت غیر متوقع طور پر دھاوا بول دیتے ہیں تو مسز بیدی پر وہ دل یا وہ گھڑیاں قیامت کی ہوتی ہیں، بیدی صاحب

مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر باورچی خانے میں چلے جاتے ہیں اور مسز بیدی کو اس قسم کی ہدایات دیتے ہیں۔

۱ :۔ امبالال ویجی ٹیرین ہے۔ اس کے لئے صرف ٹنڈے، گوبھی، دال، آلو اور پراٹھے پکا لو۔

۲ :۔ پریتم سنگھ نان ویجی ٹیرین ہے اس کے لیے جھٹکے کا گوشت، پراٹھے، کباب، قیمہ، اور کلیجی بھون لو۔

۳ :۔ نفاست علی خاں مرچیں کم کھاتا ہے اس کے لئے کم مرچوں والے چار پانچ سالن کافی ہوں گے، ساتھ ایک میٹھا، بعد میں ایک پان۔

۴ :۔ ضیغم علی خاں بہت زیادہ مرچیں کھاتے ہیں، ان کے لیے قیمے بھری شملے کی مرچیں، ہری مرچوں بھرے پراٹھے، نان، تیکھا قورمہ، دس بارہ سیخ کباب اور آدھا سیر مسور کی دال کافی ہوگی۔ یاد رکھنا وہ گن کر اکتالیس پھلکے کھاتے ہیں، کہیں بھوکے نہ رہ جائیں۔ احتیاطاً اکاون پھلکے تیار کر لینا۔

۵ :۔ پنڈت ہری سنگھ نارائن پیاز اور لہسن سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کے لیے حلوہ پوری، دال چاول اور چاول کی کھیر کافی ہوگی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پولسن کی گائی کے دو گلاس پیتے ہیں ملائی والے۔

۶ :۔ ملانند لال صرف سری پائے، اوجڑی اور گردے کھاتے ہیں، کالی گاجر کا حلوہ انہیں بہت پسند ہے لیکن پہلے حلوہ کھاتے ہیں بعد میں سری پائے۔

۷ :۔ روسی مہمان خرشچوخوان کے لیے روسی ڈشیں میری کتاب میں دیکھ کر تیار کر لینا، یا خواجہ احمد عباس کو ٹیلی فون کر کے ترکیبیں معلوم کر لینا

۸ : مسٹر ہیرالڈ انگریز ہیں، نریندر کو جلدی سے ٹیکسی پر بھیجو کہ فلورا فاونٹین جاکر تمہاری سہیلی روزی کو بلا لائے، اس کی نگرانی میں انگریزی کھانے تیار کر لینا، مسٹر ہیرالڈ کہتے ہیں کہ میں کھانا کھانے کے بعد انڈین نسوار سونگھوں گا، اختر الایمان کو ٹیلی فون کر دو کہ تھوڑی سی انڈین نسوار بھیج دے،

۹ : بصرے سے مولانا عبدالوہاب صاحب تشریف لائے ہیں، عرب عموماً بکری کا گوشت نہیں کھاتے، ان کے لیے کہیں سے بھی اونٹ کا گوشت حاصل کرو۔ اونٹ کے گوشت کے تیس چالیس کباب، قورمہ، بریانی تیار کر لینا، کچھ نان بازار سے منگوا لینا، اوہ، ہاں خیال آیا، ادھر کے لوگ شاید گھوڑے کا گوشت بھی تو کھا لیتے ہیں، کہیں سے گھوڑے کا گوشت بھی منگوا لو، ذرا زیادہ ہی منگوا لینا، میں بھی چکھوں گا کہ کیسا ہوتا ہے، اونٹ اور گھوڑے کا گوشت نہ ملے تو پڑوسیوں کا اونٹ اور کرشن چندر کا گھوڑا ذبح کرا لینا، بعد میں ان دونوں حضرات سے نپٹ لوں گا، کھجور کے حلوے کی ترکیب یاد نہ رہی ہو تو اونٹ کے دودھ کی ربڑی تیار کر لینا، محلے میں کوئی اونٹنی نہ ہو تو بکری کے دودھ میں تھوڑا نمک ڈال لینا، اونٹ کا دودھ بن جائے گا، لیکن یہ بات مولانا عبدالوہاب کو نہ معلوم ہوتے لگا، اگر عبدالوہاب صاحب کو کھانا پسند نہ آیا تو تم لوگ مشرقِ وسطیٰ میں بدنام ہو جاؤ گی اور اگر میں کبھی وہاں گیا عرب مجھ کو تھو تھو کریں گے کہ یہ ہے وہ آدمی جسے کھانا تک پکانا نہیں آتا، ہاں نوکروں سے زیادہ کام نہ لینا نہ انہیں ڈانٹنا اور دیکھو جب تک کھانا تیار نہیں ہوتا، ڈرائنگ روم میں چائے، کافی، شربت اور پان برابر بھیجتی رہنا۔ اس وقت بارہ بجے ہیں، دو بجے

تک کھانا تیار ہو جانا چاہیئے۔"

عورت چاہے کتنے ہی بڑے دل کی ہو، کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو اسے اپنے کپڑے اور زیور بہت عزیز ہوتے ہیں۔ مادام کیوری کے شوہر نے اپنی بیگم مادام کیوری سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اپنے کچھ زیور اور کپڑے ہو تو لو لو کے ریفیوجیوں میں بانٹ دو تو وہ اپنے شوہر کی اس قدر دل آزار بات سن کر سخت برہم ہو گئی تھیں، انھوں نے غصے میں آکر ٹیسٹ ٹیوبیں اور سائنس روم کے بہت سے شیشے اور لوہے کا سامان توڑ ڈالا تھا، اور اپنے شوہر کو مار پیٹ کر کے چلی گئی تھیں، مسز بیدی ایک ہندوستانی عورت ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتیں،

بیدی صاحب کے گھر پر مانگنے والے اور مانگنے والیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، جیسے ہی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے مسز بیدی آہ بھر کر کلیجہ تھام لیتی ہیں، ملنے والی اگر عورت ہے تو وہ یقیناً بیوہ ہو گی اور بیدی صاحب سے مدد لینے آئی ہو گی۔ مسز بیدی چونکہ وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں، اندر آنے والی نسوانی آواز سنتے ہی وہ فوراً چائے کی پیالی تیار کر لیتی ہیں اور ایک طشتری میں بسکٹوں کی بجائے اپنی ایک سونے کی انگوٹھی ایک سونے کی چوڑی اور ایک پازیب سجا کر چائے کی پیالی سمیت مہمان کے سامنے رکھ دیتی ہیں، مہمان خاتون چائے کی پیالی "سُڑ سُڑ" پی جاتی ہیں اور طشتری میں رکھی ہوئی چیزیں پرس میں ڈال کر بیدی صاحب سے ہاتھ ملا کر اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسز بیدی کو صبر کی تلقین کر کے چلی جاتی ہیں،

مسز بیدی کی تمام ساڑھیاں، سوٹ، شلواریں، ریشمی کرتے، نئی سینڈلیں، بیدی صاحب محتاج عورتوں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں، مسز بیدی بغیر اُف کیے "فوراً" اب

خدا کی راہ میں دے دیتی ہیں، کیونکہ اس کے سوا بیدی صاحب کے راج ہیرا ور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

بیدی صاحب کے پاس دوستوں، دشمنوں، بال بچوں اور نیک دل بیگم کے علاوہ ایک مظلوم کار بھی ہے جو دن کے وقت ان کے مہانوں، دوستوں یا دشمنوں کے کام آتی ہے اور رات کو ان کا بھنگی سیر کرنے کے لئے اسے سمندر کے ساحل پر لے جاتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ صبح سات بجے سے پہلے پہلے کار واپس لے آئے۔ سُنا ہے رات کو وہ کار بھاڑے پر بھی چلا لیتا ہے۔ اور رات بھر میں ستر بہتر روپے کما لیتا ہے بیدی صاحب بھی اس راز سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی کار کھٹارا بن جائے گی۔ مگر وہ چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ کیوں کسی بھنگی کا دل توڑا جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہریجن تحریک سب سے پہلے بیدی صاحب ہی نے شروع کی تھی۔

بیدی صاحب کا بیان ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں انہیں صرف ایک مرتبہ اپنی کار میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے وہ بھی اس وقت جب وہ کار خریدنے گئے تھے۔ اس وقت ان کے خیر خواہوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کار خریدنے جا رہے ہیں۔ ورنہ کار کے لئے انہوں نے جو روپیہ اکٹھا کیا تھا فوراً ادھار لے لیتے اور بیدی صاحب کو یا تو عمر بھر کار نصیب نہ ہوتی یا اگر ان کے دوست اس روپے سے کار خرید بھی لاتے تو بیدی صاحب کو اپنی کار میں ایک دن بھی بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔

جب وہ کار خریدنے گئے، ڈرائیور ان کے ساتھ تھا۔ بے چاری کار گیرج سے نکل کر جب سڑک پر پہنچی تو ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بیدی صاحب نے ایک بس سٹاپ کے سامنے رکوا دی اور ایک بہت ہی لمبے کیو میں کھڑے لوگوں کو

لفٹ پیش کی، دس آدمیوں نے بخوشی اپنی خدمات پیش کر دیں، ڈرائیور کے روکنے کے باوجود بیدی صاحب نے نو آدمیوں کو کار میں ٹھونس لیا، دسویں کے لئے بالکل جگہ نہ تھی، بیدی صاحب نے اپنے آپ کو گاڑی کے پیچھے کیریر پر رسّے سے بندھوا لیا اور ڈرائیور کو حکم دیا کہ دسوں مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود پر پہنچا کر ثوابِ دارین حاصل کیا جائے۔

اس کام میں پورے پانچ گھنٹے لگ گئے، کیونکہ بمبئی میں فاصلے بہت زیادہ ہیں لیکن بیدی صاحب کو جب ڈرائیور نے رسے سے کھول کر کیریر سے اتارا تو وہ بے ہوش ہو چکے تھے، ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے دے کر بڑی مشکل سے انہیں ہوش میں لایا گیا۔

پانچ گھنٹے بعد جب خالی کار لے کر بیدی صاحب آگے بڑھے تو ایک بس سٹاپ کے قریب ایک واقف کار کو دیکھ کر کار پھر کھڑی کر لی، دس گیارہ مزید مسافروں نے جو ڈیڑھ گھنٹے سے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے ان سے التجا کی کہ اگر آپ ادھر کی طرف جا رہے ہیں تو ہمیں بھی بٹھا لیجئے ڈیڑھ گھنٹے سے کھڑے ہیں مگر کوئی بس خالی نہیں ملتی۔

بیدی صاحب کسی کو "نہ" نہیں کہہ سکتے انہوں نے پھر دس سواریاں لا دلیں اور خود کار کی چھت پر بیٹھ گئے جب دھوپ بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکی تو انہوں نے سوا روپے کی برف خرید کر سر پر رکھ لی، وہ ایک تماشا تو بن گئے لیکن ہر ایک کو جہاں جانا تھا وہاں پہنچا دیا، اس طرح کار ہر ایک میل آگے بڑھنے کے بعد ان کے گھر سے بیسیوں میل دور نکل جاتی تھی، ہر سڑک پر وہ اسی طرح ولی اللہ بن کر اپنی کار میں سفر کرتے رہے

خدا جھوٹ نہ بلوائے انہیں اپنے گھر پہنچنے میں پورے تین دن لگ گئے ۔

اس عرصے میں مسز بیدی، بیدی صاحب کے گم ہو جانے کی رپورٹ شہر کے تمام پولیس اسٹیشنوں میں درج کرا چکی تھیں ۔ بیدی صاحب کے بچے بیدی صاحب کی تلاش میں شہر کی تمام فلم کمپنیوں کی خاک چھان چکے تھے ۔ ڈرائیور کی ہندو بیوی نے یہ سمجھ کر کہ وہ ودھوا ہو گئی ہے ۔ اپنے سر میں سیندور کے بجائے راکھ ڈال لی تھی ۔ اپنی کلائیوں پر اینٹیں مار مار کر تمام چوڑیاں ڈال لی تھیں ۔ تمام عزیزوں کو بذریعہ تار اکٹھا کر لیا تھا ۔ اس کی چیخوں کی آواز آسمان سے بھی آگے نکل گئی تھی ، کچھ لوگ کہہ رہے تھے ۔ کہ ہائے بیچاری کی شادی کو سات ہی دن گزرے تھے ، اور اس بیچاری کے عزیز کہہ رہے تھے ، ڈائن اپنی شادی کے ساتویں دن ہی شوہر کو کھا گئی ۔

بیدی صاحب کے قریبی عزیز بیدی صاحب کے گھر آ گئے تھے اور مسز بیدی کو طعنے دے رہے تھے کہ تم بچے کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتیں ۔ بیدی صاحب کے گھر رہنے والے پچیس مہمانوں کا برا حال تھا ، وہ کلیجہ تھام کر روتے تھے اور دھاڑیں مار مار کر کہتے تھے ۔ ہائے بیدی جی ، ہمارا کیا ہو گا ؟ خدا خدا کر کے بیدی صاحب گھر آئے اور محلے بھر کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ۔

بیدی صاحب کا کچھ وقت افسانے لکھنے ، کچھ لچے لفنگوں کی جھوٹی دردناک داستانیں سننے میں کچھ وقت محتاجوں ، فقیروں اور بیواؤں سے رو رو کر گلے ملنے میں کچھ اپنے بال بچوں کو صبر کی تلقین کرنے میں اور کچھ مختلف سیاسی پلیٹ فارموں پر تقریر کرتے میں گزر جاتا ہے ۔

بیدی صاحب پرانے راجاؤں اور مہاراجوں ۔۔۔ کی طرح رات کو غریب پرجا کا حال معلوم کرنے نکل جاتے، مہمانوں سے بچے کھچے کچھ پیسے دو ڈھائی آنے ان کی جیب میں ہوں تو مصیبت زدگان میں تقسیم کر آتے ہیں ورنہ رو رو کر ان سے زبانی ہمدردی کر لینے ہی کو کارِ ثواب سمجھ کر واپس آجاتے ہیں،

رات بھر اپنی رعایا کی دیکھ بھال کرنے کے بعد صبح چار بجے کے قریب واپس آکر اپنے گھر کے سامنے سر کے نیچے ایک اینٹ رکھ کر فٹ پاتھ پر سو جاتے ہیں، کیونکہ مہمانوں کی وجہ سے اکثر انہیں گھر میں سونے کو جگہ نہیں ملتی،

معزز مہمان صبح آکر انہیں بیدار کرتے ہیں کہ "اٹھیے، بیدی صاحب! گھر میں خرچ نہیں ہے،"

بیدی صاحب چونک کر اٹھ بیٹھتے ہیں، اٹھ کر کپڑوں کی گرد اور مٹی جھاڑتے ہیں، اندر جا کر نہاتے ہیں، چائے کی ایک پیالی پی کر یہ مظلوم اور اداس روح پیسے کی تلاش میں بمبئی کے شور و شغب میں بھٹکنے کے لئے چلی جاتی ہے،

مندرجہ بالا سطور تک مضمون مکمل تھا، ایک مہینے تک یونہی رکھا رہا کسی پرچے میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا،

ایک دن عزیزم نریندر میرے گھر گھبرائے ہوئے آئے، انھوں نے ایک عجیب خبر سنائی، ایسی خبریں تو آئے دن بیدی صاحب کے متعلق سننے میں آتی رہتی ہیں لیکن اس وقت میرا موڈ کچھ ایسا تھا کہ کچھ کر ہی بیٹھنے کو جی چاہا،

چنانچہ میں نے اور میرے دوستوں نے سازش کر کے بیدی صاحب کو ہمالیہ کی بلندی سے کوئی پانچ ہزار فٹ نیچے ایک گہرے کھڈ میں پھینک دیا کہ اب

خود ہمیں ان کی صورت نظر نہیں آتی، شروع شروع میں انہوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ اکیلے تھے اور ہم پانچ، کامیابی ہمیں کو نصیب ہوئی،

اس حادثے کا آغاز اور انجام نریندر کی آمد سے ہوا، جب میں نے اس سے پوچھا کہ اتنے گھبرائے کیوں ہو، کیا بات ہے؟ تو اس نے بتایا کہ گھر میں صرف پانچ سو روپے رکھے تھے، کہ صبح صبح تین شاعر ہمارے یہاں آ گئے، پہلے تو انہوں نے اپنی بے شمار سڑی غزلیں سنا کر بیدی صاحب سے غلط داد وصول کی، مجھے تو اس پر بھی اعتراض تھا مگر اس کے بعد اپنی گھریلو زندگی کے بہت سے فرضی دردناک افسانے سنا کر بیدی صاحب سے تمام روپے لے گئے گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے، میں نے اور ممی نے انہیں بہت سمجھایا کہ کم از کم دو سو روپے تو گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیجئے مگر وہ نہ مانے اور میں یہاں آ گیا ہوں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کبھی اپنے گھر میں واپس نہ جاؤں گا،

میں نے نریندر کو بہت سمجھایا اور کہا کہ "فکر نہ کرو میں نے بیدی صاحب کے جملہ امراض کا حل سوچ لیا ہے کل صبح صبح میں، کرشن چندر، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی تمہارے گھر آ رہے ہیں، یا تو بیدی صاحب ٹھیک ہو یا ہم سے ان کے تعلقات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے،

دوسرے دن علی الصباح ہم سب بیدی صاحب کے یہاں پہنچ گئے، انہوں نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا اور حسب توقع معذرت کر کے غسل خانے میں چلے گئے میں غسل خانے کے دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا، کہ وہ کب پانی کا ڈونگا بالٹی سے نکال کر سر پر ڈالتے ہیں،

تھوڑی دیر بعد میں نے اندازہ کر لیا کہ اس وقت وہ منہ پر صابن مل رہے ہوں گے، اور اگر میں غسل خانے کا دروازہ کھول کر بازو بڑھا کر کھونٹی پر سے ان کے کپڑے اتار لوں تو وہ نہ دیکھ سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، میں موقع دیکھ کر آنکھیں بند کیے غسل خانے میں داخل ہو گیا اور چپکے سے کھونٹی پر سے بیدی صاحب کے کپڑے اتار کر بند آنکھوں باہر نکل آیا۔ ے

ایسی چوری کا پتہ خاک لگاتا کوئی

جب وہ نہا کر فارغ ہوئے تو کھونٹی پر نظر ڈالی۔ پہلے تو انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہنس کر بولے "اے بھائی میرے کپڑے کون چور لے گیا؟" میں نے جواب دیا بیدی صاحب بہت سے آدمی دروازے کے سامنے بیٹھے ہیں خبردار باہر ننگے مت آنا بہت سی شریف قسم کی خواتین بھی موجود ہیں۔

وہ بولے "یہ بے ہودگی دے ہودگی کچھ نہیں نہ مذاق ہے، یہ حقیقت ہے اور آپ نے جو قیامتیں اٹھا رکھی ہیں، ان کا شافی علاج"

بیدی صاحب بولے "کیا تم میرا کیریکٹر خراب کرنے آئے ہو؟"

خواجہ احمد عباس بولے "آپ کو اپنے اصول بدلنے ہوں گے۔ کیونکہ زمانہ بڑا نازک ہے آپ کو دونوں ہاتھوں میری بات ماننی ہی پڑے گی"

بیدی صاحب بولے "تم نے اپنے سو روپے اس دن بھنگیوں میں کیوں بانٹ دیئے تھے؟"

خواجہ احمد عباس بولے "میں تو کمیونسٹ ہوں، تم کمیونسٹ تھوڑی ہو؟"

بیدی صاحب بولے "خیر اب تم لوگ مذاق چھوڑو، میرے کپڑے اندر پھینکو

ورنہ ساری کمیونزم نکال دوں گا،

میں نے جواب دیا: "بیدی صاحب مذاق کرنے والوں کے چہرے پر پھٹکار پانچ منٹ کے اندر اندر گھر کے تمام مفت خوروں، چوروں، ڈاکوؤں کو دفع کیجئے، لچے، لفنگوں کی نشستیں بند کیجئے اور آئندہ کے لئے وعدہ کیجئے کہ اب اپنا پیسہ گھر والوں پر صرف کریں گے، تو کپڑے ملیں گے ورنہ نہیں۔ ہم سب اپنے اصولوں کے بڑے پکے ہیں۔ اور ہم سب اس وقت ایک طے شدہ سازش کے تحت یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ایک غنڈۂ عظیم کی سرکردگی میں۔"

بیدی صاحب بولے: "تم سب جہنم میں جاؤ مجھے تم لوگوں کی کوئی پرواہ نہیں نہ تمہارے شوروں کی ضرورت ہے۔ میں باہر آکر تم سب کی طبیعت ٹھیک کردوں گا۔"

عصمت پہلی مرتبہ بولیں: "بیدی صاحب خدا کے لئے کہیں باہر مت آجایئے۔ میرے ساتھ اس وقت اور بھی بہت سی خواتین بیٹھی ہیں اور سنئے یہ بچے سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اس وقت تک باہر نہیں نکالا جائے گا جب تک آپ ایک شریف آدمی نہ بن جائیں۔"

بیدی صاحب بولے: "میں یہاں بڑے مزے میں ہوں دوست نما دشمنو!"

عصمت نے جواب دیا: "بڑے مزے میں ہیں تو مزے میں رہیے ہم آپ کے مزوں میں خلل نہیں ڈالیں گے۔"

منت خوشامد کرنے کے بعد جب بیدی صاحب کا بس نہ چلا تو مغلظات پر اتر آئے زور زور سے چلانے لگے...... عصمت صاحبہ کے سوا اتی مب

کمینو! ذلیلو، مردودو! پاجیو! شرم نہیں آتی؛ میرے کپڑے اندر پھینک دو یا یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ میں تم سب پر مداخلت بے جا کا مقدمہ دائر کر دوں گا۔

جب ہم پر ان گالیوں اور دھمکیوں کا بھی اثر نہ ہوا تو انہوں نے ہمیں وہ وہ گالیاں دینی شروع کر دیں کہ عصمت کان میں انگلیاں ٹھونس کر وہاں سے بھاگ گئیں۔

اس طرح شام کے پانچ بج گئے، پانچ بجے کے قریب میں نے چائے کی ایک پیالی اور دو بسکٹ اندر غسل خانے میں بڑھا دیئے، بیدی صاحب نے دونوں چیزیں مال غنیمت سمجھ کر جھپٹ لیں۔

رات کے گیارہ بجے تک نہ بیدی صاحب ہارے نہ ہم اتنے میں نوکر ہوٹل سے ہم سب کا کھانا لے آیا، ایک لڑکے ہم نے بیدی صاحب کو پکڑا دی۔

بیدی صاحب کھانا کھاتے جاتے تھے، اور ہمیں بد دعائیں دیتے جاتے تھے جیسے ہر لقمے کے ساتھ وہ تیکھی چٹنی استعمال کر رہے ہوں۔

اتنے میں مسز بیدی بھی گھر آگئیں، جب وہ اس معاملے میں مداخلت کرنے آئیں تو ہم سب نے ان سے جھگڑا کر لیا کہ اگر آپ نے اس معاملے میں ذرا بھی دخل دیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، چند گھنٹوں، چند دنوں یا چند ہفتوں کی تکلیف سے اگر گھر کے سب لوگوں کی جہنمی زندگی جنت بن جائے تو کیا حرج ہے۔

تمام رات ہم سب باتھ روم کے سامنے دریوں پر چوکنے ہو کر بیٹھے رہے اور رات بھر باتھ روم میں سے بیدی صاحب کی گالیوں کی صدائیں آتی رہیں

اور مسز بیدی ہم سے لڑتی رہیں کہ بُری بات ہے،

دوسرے دن صبح ہم نے انہیں ناشتہ بھی پہنچایا اور دوپہر اور رات کا کھانا بھی، کھانا کھا کر وہ برتن مارے غصّے کے کھڑکی کی سلاخوں میں سے باہر سڑک پر پھینک دیتے تھے۔ اور ساتھ ہی پچیس ہزار گالیاں فضا میں گونج جاتی تھی،

اس طرح تین دن گزر گئے، ان تین دنوں میں ہم پر مسز بیدی پر اور بیدی صاحب پر جو بیتی، کچھ نہ پوچھئے یہاں تک کہ مسز بیدی ہم سے ناراض ہو گئیں، نریندر مارے شرم کے گھر سے بھاگ گیا، ہم ڈھیٹوں کی طرح ڈٹے رہے، چوتھے دن بیدی صاحب کو ہار ماننی پڑی اور ہم نے اِن سے مندرجہ ذیل حلفیہ وعدے لے لئے جو انہوں نے باتھ روم میں بیٹھے بیٹھے ہزاروں گالیوں کے ساتھ دہرائے،

۱ : میں مسمّی راجندر سنگھ بیدی آئندہ بڑی بڑی نیکیاں نہیں کروں گا ۔۔۔۔ تم کمینے، پاجی، رذیل ہو!

۲ : بیکار اور لچے لفنگوں میں اپنی دولت تقسیم نہیں کروں گا ۔۔۔۔ جیسے تم لوگ، لعنت ہو تم سب پر!

۳ : تمام مہمانوں کو گھر سے نکال دوں گا، پنشن بند کر دوں گا ۔۔۔۔ خدا تمہارا بیڑہ غرق کرے ۔۔!

۴ : جب تک زندہ رہوں گا نیک چلن رہوں گا، نیک چلنی سے مراد وہ چلن ہیں جنہیں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس مہندر ناتھ اور راجہ مہدی علی خاں

جیسے غنڈے اچھے چلن قرار دیں ..... بڑے آئے رہنمایانِ قوم!

۵ : تم لوگوں کے مشورے اور تحقیقات کے بغیر کسی کو ایک پیسہ نہ دوں گا ....

تمہاری طرح کمینہ بن جاؤنگا۔ یہ پانچوں شرطیں منوالنے کے بعد ہم نے بیدی کو کپڑے دے کر باتھ روم سے باہر نکالا۔ جب وہ باہر نکلے تو مارے غصّے کے بپھرے ہوئے تھے، بھابی اور عصمت کو چھوڑ کر انہوں نے ہم سب کو ایک لٹھیا سے آنا پیٹا کہ کسی کی ہڈی غائب ہوگئی اور کسی کی پسلی۔ جب ہم نے شور مچایا تو بولے کہ میں نے یہ قسم تو نہیں کھائی تھی کہ تم لوگوں کی مرمت نہیں کروں گا۔ آئندہ سے میری تمہاری دوستی ختم خبردار جو کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔

میں نے جواب دیا: آپ ہم سے ناراض ہوں یا ناخوش یا بیزار ہم لوگوں نے تین راتیں جاگ کر اور اپنے کاموں کاجوں کا ہرج کر کے آپ کے گھر میں امن وخوشی کے چراغ جلا دیئے ہیں، ہمارا یہی مقصد تھا جو پورا ہوگیا۔

اس حادثے کے بعد نہ کبھی بیدی صاحب نے ہمیں اپنے گھر بلایا نہ کبھی ہم ان کے گھر گئے۔

ایک مرتبہ وہ اپنی کار میں بیٹھے ایک بس اسٹاپ سے گزرے، خدا کے فضل وکرم سے اب کے کار میں صرف بیدی صاحب تھے، انھوں نے ہمیں ایک لمبے کیو میں دیکھ لیا اور بڑے زور سے کار بھگا کر لے گئے، میں نے کرشن چندر کو دیکھ کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

خواجہ صاحب بولے: جو شخص اپنی گاڑی میں دس دس آدمیوں کو بٹھا کے اپنے آپ کو کیریر پر بندھوا لیتا تھا، آج دوستوں کو دیکھ کر کیسا اینٹھو

ہو گیا۔

مہندر ناتھ نے کہا، "اب بیدی صحیح معنوں میں انسان بن گیا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں، اب شاید اس کا بھنگی بھی بیکار ہو گیا ہو گا"

ہم چاروں نے نعرہ لگایا، "راجندر سنگھ بیدی زندہ باد! ہم لوگ زندہ باد"

سوائے بیدی صاحب کے مانگنے والے دوستو اور نہ مانگنے والے دشمنو!

سن لو کہ بیدی صاحب پہلے سے بیدی صاحب نہیں رہے۔ اب کوئی صاحب ان کے یہاں جا کر اپنا وقت اور بس یا ٹیکسی کا کرایہ ضائع نہ کریں۔

ٌ

راجہ مہدی علیخاں

جوگیا

نہا دھو کر، نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آ کر کھڑی ہوئی اور میں اپنے ہال سے تھوڑا نیچے ہٹ کر دیکھنے لگا ایسے میں دروازہ کو ہاتھ لگا تو چوں کی ایک بے سری آواز پیدا ہوئی، بڑے بھیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑ کر بولے،

"کیا ہے جگل؟"

"کچھ نہیں موٹے بھیا" میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا "گرمی بہت ہے۔"

اور پھر میں سامنے دیکھنے لگا..... ساری کے سلسلے میں آج جوگیا کون سا رنگ چنتی ہے!

میں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا، رنگ میرے حواس پر چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبا دیوی کی وادی سٹیبٹ اگیاری لین میں تھا، پارسیوں کی اگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی، یہاں پر صرف مکان تھے، آمنے سامنے اور ایک

دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے، ان مکانوں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی ملائم ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ..... سینہ بہ سینہ لب بہ لب غلیظ اور مقدس۔

سامنے باپو گھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا...... ابھی بجور کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنے ہی ہاتھ کاٹ لیے ہیں۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے گھی اور تیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر چلی ہے..... جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ایسے ہی انہیں بھی ہمارا سب کچھ نظر آتا ہوگا۔

جوگیا کے گھر کا نام تو رنچھوڑ تو اس تھا لیکن میں اسے باپو گھر کی قسم کا مکان اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں جن میں سے ایک جوگیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی کہ جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی، قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا، لیکن بدن کے بھرے پرے اور گٹھے ہوتے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ جوگیا دال، رنگنا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی شری کھنڈ سے اتنی تندرست ہوسکتی ہے، بہر حال ان لڑکیوں کا

کچھ مت کہیے جو بھی کھاتی ہیں الم غلم اِن کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصّوں کو لگتا ہے۔۔۔ جنہیں ہیں تو صحیح کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں تیکھے پتلے، پیلے پیلے خطوط کی بہ نسبت مجھے گہرے گہرے اور بھرپور خط اچھے لگتے ہیں۔۔۔ جوگیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رُخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں، مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹنکے ہوئے تھے، سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنہیں کبھی وہ ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر مچلتی رہتیں۔۔۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تار امنڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔۔۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی، کب اور کس وقت اور کیا کرنا ہے، یہ وہی جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا، گڑبڑ تھی تو صرف رنگ کی کیونکہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گدرا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی چیزیں اتنی متناسب نہ ہوتیں تو بس چھٹی ہو گئی تھی،

میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی، جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی،

عجیب سہیلی پنا تھا کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جسے صرف جوگیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے، کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے اس لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جوگیا سب کو سبق دے جاتی تھی، میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا، ایسے رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ تھا لیکن میری مجبوریاں تھیں، میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔۔۔۔۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے اور لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں بنا کسی التفات کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں؛ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہوگی۔۔۔۔۔ شاید ان کو کوئی ایسا لطف آتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جوگیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے جوگیا کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے۔۔۔۔۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا، جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور

منہ میں ٹھنڈا دسمبر پڑھتا رہتا تھا۔ وہ صرف وہ ہمارے سردش کو سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اسے ضرور صاحب جی کہتے اور پھر اس راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے لہو ولعب، میٹرو سینما کی طرف جاتا تھا جہاں پہنچ کر جو گیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور اس بات پر کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی، اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ ۔ ۔ صرف میں اور جو گیا پہنچے تھے، اور وہ بھی دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے، محسوس کرنے کے لئے۔ ۔ ۔ پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے۔ جو ہو میں ایک صبح، کے نام کی ایک بڑی سی تصویر تھی جس میں اوپر کے حصے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدے طریقے سے تھوپا اور بچارا گیا تھا۔ جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ ۔ ۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جو گیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔ ۔ ۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور میں جانتا تھا محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے۔ ۔ ۔ اور آدمی چلنے سے پہلے ہی تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ ۔ ۔ دیکھئے کوئی آتا مرتا ہے یا

نہیں..... اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا،
جبھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا تھا،
اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا..... ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آچکے تھے،.... چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ٹھٹھکا اور پھر اسٹول کے پاس، جوگیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو بس اتنا، "جوگیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں؟"
"سامنے آکے سناؤ" جوگیا بولی۔
میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے۔"
میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے سے اس کے کانوں کی لوؤں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی
آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔
"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا"
"ہوں" جوگیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دل چسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔
"وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا"
اس پر جوگیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا "تم لطیفہ سنا رہے ہو؟"
"ہاں" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا،
اور جوگیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی...... منتظر.... ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا.... جس میں لمحات کے شرارے کسی بارود سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہے تھے، خلا میں پھٹ رہے تھے، اور آخر معدومیت کا

حصّہ ہوتے جا رہے تھے، جبھی جوہو میں ایک صبح میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا: "وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آگئی۔۔۔ آخر اس نے سوچا اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں، کیوں نہ میں اسے ایسا موقع دوں، شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلایا۔ لڑکا آیا بھی، گلدستہ بھی لایا جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا۔۔۔ یہ کتنا پیارا ہے، یہ اودے میں گلابی، گلابی میں سفید رنگ کے پھول۔۔۔ ان کے بدلے میں تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے۔"

"پھر؟" جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

پھر۔۔۔ لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا۔ مگر۔۔۔ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا دروازے کی طرف۔

"ہے بھگوان!" اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: "لڑکی بولی۔ کہاں جا رہے ہو لالی! جس پر لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا۔ اور پھول لینے۔"

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اس کا انتظار ابدیت پر چھا جاتا، میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازو جکڑ کر اس کا منہ چوم لیا تھا۔۔۔ اب جوگیا بناوٹی غصّے سے مجھے ہلکے ہلکے تھپڑ لگا رہی تھی، اور اپنے ہونٹ پونچھ رہی تھی۔ وہ ہنس نہ سکتی تھی کیونکہ وہ ناراض تھی اور خوش تھی۔ محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں

نے ہرا ابھار کر دیا تھا... اس دن اگر ہم جوشیلے سرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی۔ جس کا نام تھا کوئی کسی کا نہیں اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیئے رو رہی تھی، سب رنگوں میں اداسی تھی اور وہ ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا جب کہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے، جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی.... جوگیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا، مکا دکھایا، مسکرائی اور دوڑ گئی۔

کچھ دیر یوں ہی ادھر ادھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں... لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، پیلا، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں.... کسی کو خیال بھی نہیں آیا، ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا، اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوئے ہیں... میرا گلا تشکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا... میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا... اس ایک لمس سے جوگیا ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، کسی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا چھن جس میں سچائی ہو، ولولہ ہو، بد نصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے۔

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جو گیا اپنی الماری میں سے نکالتی ہے، اگر وہ مجھے میرے ہال کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی۔ آج کون سی ساری پہنوں اور اس میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا میں تو جاننا چاہتا تھا، صبح سویرے نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساری کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو اس میں کون سی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے۔۔۔ آج گلابی رنگ کی ساری پہننی چاہیے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پُر اسرار ہے اور پُر پیچ۔ اتنا بھید، اتنا بھید کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا، سُنا ہے چاند نہ صرف عورتوں کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی میں نہیں، وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے۔ تبھی۔۔۔ تبھی ساری پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے۔۔۔ آج کون سی ساری پہنوں!

نہیں نہیں۔۔۔ اس کا اپنا رنگ ہے اپنا فیصلہ، ہر کسی کو کوئی مرد تھوڑا ہی بتاتے جاتا ہے۔ پھر رات کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے اس کا اپنا رنگ

اس دن واقعی بہت گرمی تھی۔ نیچے وادی شیٹ اگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بھٹیارن دانے بھون رہی ہے جبھی کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکئی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیتے وہ سب ساریاں تھیں جن میں سے ایک جوگیا اپنے لیے، میرے لیے، ساری دنیا کے لیے، چمنا رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا، شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں لیکن میں نے تو کسی ادٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا، اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا جبھی میں نے سوچا۔۔۔ میں نے چھپنے کی بہت کوشش کی لیکن جوگیا نے اپنے سایہ میں بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے،

پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا ملن۔ معلوم ہوتا تھا اگیارہ تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں، اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا ــ" آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے، جوگی۔۔۔۔"

"میں جانتی تھی تم اسے پسند کرو گے"۔

"تم کیسے جانتی تھی؟"

"ایسے ہی۔۔۔۔ کبھی کبھی تمہارا من میرے من میں آجاتا ہے"۔

"ہوں ـ" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔۔۔" آج تمہیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"کیا جی چاہتا ہے"

اسی وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ آگئی جس کو نکلنے میں صدیاں لگیں، میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں، جب تک ہم پرنس اسٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آچکے تھے، جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے، میں نے کہا۔ "آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں"

روؤ!... کیوں؟

"شاستر کہتے ہیں آتمک پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں"

کون سا پاپ ہے تمہاری آتما میں

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھ سکتیں اور پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں، جوگیا نہ سمجھ سکی، اپنا ہی کول پیار اس کے من میں چلا آیا تھا۔ "جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟"

"کیا... کیا... کیا؟ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے... اور اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساری کی طرف اشارہ کیا تمہیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آپ واپس آؤں نہ تمہیں آنے دوں" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے کبھی وہ آتی تھیں،

میں کچھ دیر کے لیے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پر لے گئی ہیں جہاں سے وہ خود آتی ہیں اور نہ انہیں آنے دیتی ہیں۔ خدا بھی

ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ایک سرد آہ بھر کر چلا جاتا ہے۔
مڑ کے دیکھا تو جو گیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جو گیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی، جس کا احساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا، حدت سے پھٹتی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پہ سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر گرمی کے ستائے ہوئے آ جا رہے تھے جبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے، وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی۔ لانبی اونچی، باب کٹے بال، جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں دو، تین، چار ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں۔

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری، اسکرٹ بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا۔۔۔ سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کون سی بات، کون سا ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے۔۔۔ آج مولسری پہننا چاہئے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے، پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ اپنے آپ کسی

دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً سرسوں کا سا پیلا رنگ، چمپئی رنگ گل اناری، کاسنی، فیروزی۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ کون سا لے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار، پورا سنسار ایک ہی رنگ سے بھر جاتا ہے۔ شاید یہ موسم کی بات ہے یا دیسے ہی چاند کی، بادل کی۔۔۔۔ شاید کوئی مروجہ فیشن، کسی ایکٹریس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے؟۔۔۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ بعض اوقات وہ زنگار رنگ کپڑے بھی پہنتی ہیں اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا۔ جب کہ میں اسکول پہنچا، ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آ رہے تھے کچھ آ کر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

ان میں سوکیشی بھی تھی اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ نیلا تھا۔

اگر ہنمیت، میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہنمیت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں وسنت تھا۔۔۔ بہار جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی اور تضحیک رہتی تھی جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے۔۔۔ سالے، چاہے وہاں کا زور لگا لے تو کبھی آرسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جاتے

کی نوبت آئی ہے ، بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں۔ کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگے ہیں ؟ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پہ جھپٹتے ہیں اور اپنا منہ تیری تصویر انعامی مقابلہ میں اوّل آئی ہو ؟ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر چل دیئے ہیں ؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تھا وہ تو تھا۔۔ تیرے چہرے پر سیاہیاں چھٹی ہیں اور تیرے خدوخال اتنے سخت، گھناؤنے اور طاقت ور ہوئے ہیں۔ جیسے میکسیکو کے میورلز :

آج پھر میں نے اسے بتایا شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا رنگ پہنے نکل آئی ہیں ہنمیت نے اپنے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا ، وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے ، میں نے سوکیشی کی طرف اشارہ کیا جسے ہم ماڈل کہا کرتے ہیں ، وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی ، لیکن اس کے بدن کے خطوط بالکل ویسی لڑکیوں کے تھے ، میں نے کہا ، دیکھو آج یہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے ۔
ہنمیت نے مجھے کچھ نہ کہا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمپاونڈ سے لان پر لے آیا جو بام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا ، وہاں ایک کنارے پر پہنچ کر وہ باڑ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی ، ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا دکٹوریہ ٹرمینس اور ہارنبی

بی روڈ کی طرف، وہ ثابت کرنا چاہتا تھا یہ سب میرا وہم ہے وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی، اگر عورتیں اپنے اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساری میں چھپا کر اوپر امبروں پر اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد نظر نہ آتے... لیکن... یا یہ اس طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں... سروکار ہی نہ تھا... کوئی لانبا تھا اور کوئی ناٹا، کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور توندیلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ تبھی ادھر سے جیسے لوہے کی بنی ہوئی گھاٹن گزری جس نے ہرے رنگ کا کاشٹا لگا رکھا تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمنیت بولا "پہچان اپنی ماں کو..."

میں نے بیکار کی غداری کی۔ "میں ان بیچاری غریب مزدور عورتوں کی بات نہیں کرتا۔"

"کن کی کرتے ہو؟"

"ان کی، جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔"

تبھی میری بدقسمتی سے ایک لیڈان، سامنے پارسی دارو والے کے ہاں رکی اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی، وہ اس جماعت کی نمائندہ تھی جن کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں اس لیے جب وہ اپنے وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندریوں کا وہ بے تار برقی کا پیغام نہیں آتا، ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع

داقسام سا ڈھیر لگا دیے اور ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔ وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساری پہن رکھی تھی، پچاس فٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلہ سا رنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرمٹ کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ وسکی اور چند بیئر کی بوتلیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور ڈگی کھول کر اس میں رکھنے لگا جب تک میں ... ہنمیت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا۔ اپنی خفت کو چھپانے کیلئے میں نے کہا۔

یہ بیئر کی بوتلیں ...... کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔

ایسے ہی میں ہنمیت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساریاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں، مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے لیکن جب ہنمیت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے، آخر میں نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا،

لیکن وہ چھوٹتا کیسے، ایک دن جوگیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساری کا بیحد خوب صورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی تخلیق کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساری کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کی ایک آدھ تار جھلملا رہی تھی،

کئی موسم بدلے، خزاں گئی تو بہار آئی ۔۔۔ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار
بمبئی میں آسکتی ہیں اور پھر اس بہار میں ایک کاوش سی پیدا ہونی شروع ہوئی
ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو حد درجہ گداز کر دیتی ہے
اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں، پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا اور اس
پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ ٹپ سی ہوا
پانی پر دوشالہ بن دیتی ہے، پھر سمندر میں اس قدر زمرد گھلا کہ تسلیم ہو گیا اور اس
میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی
گیروں کے حوالے کرنے لگیں، پھر آسماں پر صورت و بجلی کا ٹکراؤ ہوا بادل گرجے
بجلی تڑپی اور یکایک پھاجوں پانی پڑنے لگا، اس عرصہ میں جوگیا نے کئی نیلے پیلے
اودے، کالے، سرمئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے اسے کتنی جلدی تھی
لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہو جانے کی مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت
مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں ہوں گے بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں
میں انہیں کیسے سنبھالوں گا، اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اسٹک لگانے کی اجازت
بھی لے چکی تھی ۔۔۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جا رہی تھی اور دوسری
طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی، جوگیا نے لپ اسٹک استعمال کرنے کی اجازت لے
لی تھی اتنی ساریوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنے لپ اسٹک کہاں سے لاتی؛ میں
نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ اسٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش
ہوئی ۔۔۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے

دی ہو... وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گر گام کے ٹرام -- پٹے پر کھڑی ہے وہ مجھ سے لپٹ گئی .... اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں اندر دھنس گئیں اور نمی باہر چھلکنے لگی، میں سمجھ گیا جو گیا بے حد جذباتی لڑکی ہے، بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی، لیکن بات دوسری تھی، جس رنگ کی میں لپ اسٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساری جو گیا کے پاس نہ تھی، اور نہ خریدنے کے پیے پیسے تھے، میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوبصورت سی ساری خرید کر اسے دے سکتا۔ میں نے تو لپ اسٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا سے چرائے تھے اور یا بھابی کے ساتھ اس عشق میں بٹورے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے،

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشہ ہوا... جو گیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیق بیچ ڈالے اور میری لپ اسٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ایک ساری خرید لی... اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی، جو گیا کی سہیلی رسما!... جو گیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساری پہنی اور جب ہم اگیاری پار، لاقانونیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جو کہا! آج تم کیا لگ رہی ہو؟

"کیا لگتی ہوں"؟

"بیر بہوٹی... جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے"۔

جو گیا کے دل میں کوئی شرارت آئی، میری طرف دیکھا اور بولی "جانتے ہو تم کون ہو"؟

"بیر۔۔۔۔ اور میں بیربہوٹی"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔۔۔ اپنی آنکھوں کے اس جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہنمیت سے کہدیا۔ اب کے ہنمیت نے اکیلے نہیں تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہ عام پر میری بے عزتی کی۔۔۔۔ شاید مجھے اتنا ہی بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سوکیشی وہاں نہ آجاتی جو سفید نائیلون کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آرہی تھی۔۔۔ وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جارہی تھی،

جوگیا کی بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی، اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا لیکن میں کچھ نہ کرسکتا تھا۔۔۔ سوائے اس کے کہ میں اسکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کرلوں اور یا تصویریں بنا کر بلا بارہل اور وارڈن روڈ کے چھوٹے وقیقہ شناسوں کو اونے پونے میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لیے وقت چاہیے تھا جو میرے پاس تو بہت تھا، تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس نہ تھا، محنت اور مشقت کی وجہ سے جیسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا،

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موٹے بھیا سے کہدوں لیکن مجھے اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی رہیا، بانو گھر میں جوگیا کے پیار دلار لیتی ہوئی، ایکا ایکی اپنے گھر میں آدھمکی اور دھڑ سے کہہ ڈالتی۔

کاکا! کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر ڈالتے۔

اور میں ہمیشہ کہتا۔ "دھت"

"یہ دھت" اگر میں ہی کہتا رہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد بیبا کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا اور بھابی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہلیز پر جا رہی۔۔۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جوگیا اور بجور کی ماں اور پنجابن نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ باہو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں ان سے باتیں کر لینا ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ کو اشارہ سے سلام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بستری کر لینا بھی ٹھیک تھا لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال ان کا زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں۔۔۔ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا چوڑا دے دلا نہ سکتی تھی، اس لئے ہمارے گھر میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔۔۔ تیار ہو گئی مرنے کو۔۔۔ خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔۔۔ جوگیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا، اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک بنگالی تھا جو بردے

میں بڑے عرصے تک رہا تھا جو بھی ہو وہ سب باتیں تھیں، ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں مناودر کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہیں مانا جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جوگیا کی ماں، ایک بیاہتا عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے نہ پڑنے دیا اور وہ بمبئی چلی گئی، کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔۔۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے اور جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔۔۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی سے جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دیا۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن سے وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی، اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں میں تیل چھڑک کر جل مرے گی، جوگیا ب کالج نہ جاتی تھی اور باپو گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے لئے ترس گئے تھے،

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی، سر شام ہی سے اندھیرے میں چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میرا خون، چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے

ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑتے جا رہے ہیں۔ ان شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے جس اور جانکاہی کا رنگ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آئی ہیں وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ماں کی چھاتیاں اور محبوبہ کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی،

افوہ...... اتنی گھٹن، اتنی اداسی...... اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے...... میلا میلا، چھدرا چھدرا، جیسے منہ میں ریت بے شمار ذرے اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے، جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے،

صبح اٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا، اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اسے لیکر کہیں نکل جاتا...... تبھی مجھے براگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لیکر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے اور پھر بیٹھ کر ادم منے پدمنے کا ورد کرنے لگتے ہیں،

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا، لیکن سامنے بابنو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں نہیں سوتی اس کے بال بے حد روکھے تھے اور

یونہی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے، اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی، کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی،

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا، راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے، انہیں کس نے بتایا تھا؟ ... وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی، اور منہ میں بھجن تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے، وہ بھکشونی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انھیں کھٹکھٹا رہی تھیں، ... اس بھرے شہر بمبئی میں کوئی انہیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہ آ رہا تھا،

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی، بولا شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے۔

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا، لیکن اپنے آپ ہی میرے منہ سے نکل گیا ... "آج سب جوگنیں بن گئی ہیں، سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے،

اس دن میں اسے اور سوکیشی کو گلمہر کے نیچے سے پام کے پیڑوں میں سے گھسیٹتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا، سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے ساکت تھے، ان سب نے بیراگ پا لیا تھا، اور جوگیا کھتیاں پہنے بلا ارادہ بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے،

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا، وہ جوگیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لیے جا رہی تھی ہنمیت کھکھلا کے ہنسا، ساتھ سوکیشی بھی ہنسی جس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کولہے، اس کی رانیں تک دکھائی دے رہی تھیں، وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی۔

جب ہنمیت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا: "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جنگل کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو ایک اودی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے، ایک خوبصورت پرس ہے" سوکیشی نے بھی ہنمیت کی تائید کی۔

میں حواس باختہ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھ رہا۔ جبھی ایک بس رکی اور اس بس سے ایک لڑکی اتری۔۔۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے" میں نے اپنے آپ کہا۔۔۔ "وہ جوگن ہے، جوگیا کپڑے پہنے ہوئے۔ میں کیا اندھا ہوں؟"

لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لیے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔۔۔ ہنمیت۔۔۔

لیکن ہنمیت اور سوکیشی ایک دوسرے کی بانہہ میں بانہہ ڈالے اندر جا چکے تھے، ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے، وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا کے کنارے چھوڑ گئے تھے جیسے کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں۔۔۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے۔

اور وہ لڑکی اس طرف آرہی تھی... اب تو مجھے پورے سنسار پر پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا، اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی بلند آواز کے ساتھ منیمیت اور سوکیشی کو پکارتا، وہ لڑکی میرے قریب آچکی تھی میں نے ایک آواز سنی .... بیر"

اور میں نے چونک کر دیکھا، کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، کیونکہ وہ خود جوگیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے بانپور گھر کے کھلے دروازے میں سے، سب ساریوں میں سے جوگیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا تھا... ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور عجیب ترب لبسی کے عالم میں رک گیا جوگیا بولی "میں کل بڑودے جارہی ہوں"

"کیوں جوگیا، بڑودے میں کیا ہے"

"میری ننھیال... وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے پرسوں..."

"او..."

"میں تم سے ملنے آئی تھی"

"تو لو... میں جانے کیا کہہ رہا تھا"

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صابری اور کچھ دوسرے لوگ آجا رہے تھے جب کہ جوگیا نے ایک کراتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں لڑکھلایا اور لڑکھڑا کر رہ گیا... وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا

بوسہ کتنا مرتعش تھا کتنی مقدس وحشت اور شہوت تھی اس میں اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہیں وہ دکھائی نہ دیئے ،

"وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے" جاتے ہوئے جوگیا نے کہا،

"میرے جانے کے بعد تم روئے تو تمہیں ماروں گی، ہاں اور ساتھ ہی اس نے مجھے منکا دکھایا ... اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی ۔

سویرے گیان بھون اور بانپو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی جس پر بازار کا بوجھ اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک رکھ رہے تھے اور کچھ یوں ہی ادھر ادھر کا سامان ۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے بانپو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا موٹے بھیا اور بھابی تو کیا آتے معصوم ہیما کو بھی انہوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آ رہی تھی ....

بجور کی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی ۔ تھوڑا سانس درست کیا اور سب کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی ۔ اچھا بہنو! ہم چلتے بھلے ، تم بستے بھلے ،

اور پھر آئی ... جوگیا ،

جوگیا نے ہلکے ، گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا ۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر

انکلا میں نے عادتاً کہا صاحب جی "صاحب جی پارسی پروہت نے کہا اور پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا ... آشیرواد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

جب، میں نے بھی مسکرادیا۔!

کندن

بہت ہی مرا مرا سا دن تھا جب کہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی۔ ملبے دھڑا دھڑ ایک دوسرے پہ ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا تھا۔

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی ایک ہاتھ سے اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پر ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیے تھا مگر پھاٹک کے آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سرجو کے پاس رک گئی۔

سرجو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا جب کہ وہ نئی نئی وس کونسن یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک چیپلن فادر فشر رہا کرتا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکہ چلا گیا اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کندن سرجو کے پاس آئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی، جہاں پتے اب تک

اندھیرے کا رنگ دے چکے تھے، البتہ نیچے کی سفید ملائم اور رچی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ ایک طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اسی دم جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لیے اور ہاتھ میں مسل کر انہیں سونگھنے اور لا بنے لا بنے سانس لینے لگی جیسے اسے زکام ہو اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اس کے رگوں و ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا کھسیائی۔۔۔ "میں تو سر کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں ماں۔" اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک قطرے رس رہے تھے جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ دوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی۔۔۔ "پودے دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں کندنا۔"

"کیوں رات کو کیوں؟"

"اتنی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔"

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ماں ایک پیڑ کے ساتھ اپنے بیٹی کی بیمار سی محبت کو دیکھ کر اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو بنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا۔۔۔ "پھر کیا یاد ہی جلگین، نکھی نے۔"

نکھی کندن کی کم سن، نوکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رکتے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب؟" اور پھر جیسے اپنے آپ ہی سمجھ گئی۔۔۔ "شروع ہو گیا؟"

"ہاں"

"کب"؟

"جب پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹالی فون کرایا تھا"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے زمین ہی پر بیٹھ گئی، حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی آدھی درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔۔۔ یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو یا مر چکا ہو۔

ادھر بھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی۔ ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی اس کی آخری گالی تھی۔۔۔"چھنار۔۔۔۔" جبھی بھی کی چیخ سنائی دی۔ ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں، جیسے بھی انہیں سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔۔۔ شاید زچگی کے درد میں مبتلا عورت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ماں"۔

"سن رہی ہوں" ماں نے اپنے بوڑھے چرچ چوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی۔۔۔"مجھے بھی کان دیے ہیں پرماتما نے" وہ بولی۔۔۔ اور سچ مچ ہی اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں چلا اٹھی۔"مرتی ہے تو مر جائے کیوں نہیں دن کے وقت بیاتی رانڈ؟۔۔۔ پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا۔۔۔

ماں بولے بنیر بھی نہ رہ سکتی تھی" کیسے خون خون ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو تو چنڈی میں نہوائے تھے۔ تم نے پیسے بھیجے تھے...... میں اس کے باپ کی دائی ہوں"! پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی گئے چیخ جو تھوڑے تھوڑے رقفے لیے سنائی دے رہی تھی مسلسل ہو گئی کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آثار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی نیچے کھنچنے لگیں سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں! ... وہ غریب ہے، پیسے والے سو دارو کر سکتے ہیں۔

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چلی۔ ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی "کندنا"! اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی ... "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے"!

ماں بکھی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اہمیت کو جتانا بھی جاتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔ صرف ایک ہی لفظ کندن کے کان میں پڑا ۔۔ "چمار" کہیں سے کوئی چمگادڑ اڑا اور ڈرائنگ روم کے اندر پیرابولا کی شکل پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا، جس میں سے ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھنبٹے قطار در قطار اندر آ رہے تھے۔ اور سو واٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ چلتا، صرف نیچے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہو اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہو۔ کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچ نیچ سب

نظر آتا ہے مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے ۔ صرف اس کے عادی ہو جانے پر صیقلتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے سائے دکھائی دیتے ہیں جو اس یکسانیت میں اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں ۔ آدمی گھبرا کر کھڑکی پھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لئے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے ۔

کندن واپس آکر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا ۔۔۔ کندن انتظار کرنے لگی ۔

پہلے تو انتظار ٹک ٹک کرتا رہا پھر وہاں سے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح ٹن ٹن بجنے لگا چیخیں تھم چکی تھیں ، شاید ماں کے پہنچ جانے سے مکھی کو حوصلہ ہو گیا تھا ، شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا نہیں بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا ، شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے ۔۔۔ کندن مکھی کی کھولی تک جا پہنچی لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو ۔ پھر مکھی کے ہنکنے کی آواز جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کر رہی ہو ، کندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی ۔۔۔ راستے میں سرجو کی طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھائی دیا ، جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی ۔

تھوڑے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگی ۔ ان پر کھڑکی میں آنے والے بے شمار ٹڈے بکھرے پڑے تھے ۔ جن

کے پر جلے ہوئے تھے، اور بدن مردہ ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا، مرد عورتوں کے بغیر"۔۔اس نے کتاب کھولی پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی ؛ عورتیں مرد کے بغیر ۔۔۔"

خادر دیہم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کندن ایم اے ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں مردوں کے بغیر ۔۔۔ پہلی ماں ۔۔۔ سبھاشنی جو اب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار ملبے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے اس کا نام آج کل لڑکیوں کا سا تھا، لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں نئے نام پرانے ہو چکے تھے، اور نئی طرز کے رفع نہ ہوئے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آئے تھے، جیسے ۔کندن ۔۔۔ جو نام تو بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا، چھبیس برس کا ۔۔۔ خوبصورت اور دمکتا ہوا ۔۔۔ سبھاشنی بدھوا تھی اور کندن یتیم ۔۔۔ اس نے تو باپ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اور زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہی تھی ۔ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی، کہ ماں کے بیان کے مطابق کندن کا باپ چل بسا تھا۔ اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پڑی تھی اس نے موت میں موسیٰ اور بھوٹ کو برابر کر دیا تھا عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی ۔ اس لیے جب مشن میں نادر مائیکل آسمانی باپ کی باتیں کرتا تو کندن ہمیشہ سوچنے لگتی ۔۔۔ وہ تو مر چکا ہے کسی زمینی پلیگ میں ۔۔۔ اور جب اسے کہا جاتا کہ آسمانی باپ لافانی ہے وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا ، تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں ترسیب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جانا چاہیے خواہ وہ کیتھولک چپلن ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک

پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے ،

کئی بار کندن نے چچا تاؤ اور ددھیال کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا "سب مر کھپ گئے" دوسری پلیگ میں تیسری پلیگ کب آنے والی تھی! پھر! پھر ایکا ایکی متجسس سی نگاہیں کندن پر پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی۔ "تو کیوں پوچھتی ہے ؟

" ایسے ہی کندن جواب دیتی اور پھر کہہ اُٹھتی ۔ ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے

بھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی اموںک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا جو امرت سر میں لاہور اور تبت سے آئے ہوئے کھڈ کا بیوپار کرتا تھا، کھڈ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے ، وہ مرتا ضرور ہے ، لیکن اس سے پہلے وصیت کرجاتا ہے ۔ سبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے اور اس کے عوض روٹی کے روکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے، اسی لئے کندن کے لئے اس کی لوریاں بھجن ہوگئی تھیں ۔۔ ۔ ۔ روکھا سوکھا رام کا مکڑا میٹھا بھی اور سلونا بھی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھابی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی کیونکہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالانکہ بھابی کا خرچ کی وجہ سے چاند کی طرح گھٹتا جا رہا تھا ۔ ۔ ۔ بھابی کے کپڑوں میں سبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی، وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے زمین پہ سوتی تھی اور ایک رہبانیت سی اس کے جذبات پہ چھائی رہتی تھی، جس میں اداسی بھری ایک تسلی تھی اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ

چارپائی پہ سوتے سے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے۔ سوائے سردی کے موسم میں ان کی ضرورت بھی کیا تھی۔ پھر سہاشنی سوتی ہی کہاں تھی جاگتی بھی کہاں تھی، وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اس کا سہارا ہوتے۔

جب نینن سے نیند گنوائی تکیہ لیف بچھونا کیا!
آخر سمجھ بوجھ کچھ سوچ پایا، پیار کیا تو رونا کیا

بھابی کی گالیوں کو سہاشنی نے گھی کی نالیں سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں۔ یوں کندن کو پڑھایا۔ باقی وہ وظیفوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکہ جا پہنچی وہ خوبصورت تو تھی ہی اس پر تعلیم نے اس کے حسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں بیسوں شک تھے اور وسوسے ایک عجیب سے انتظار میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھینچ آئی تھیں معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔۔۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتی رہتی تھی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔۔۔ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی، مگر کمٹھ نے اس کی زندگی بچا لی تاکہ وہ بڑی ہو کر یوکلپٹس کا پیڑ ہو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہوا ورنہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی،

تیسری عورت لکھی تھی، وہ تیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست، اس کا اصلی نام لکھشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام سدھو نگر کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کا نام کچھ یوں چڑھا کہ پھر نہ ہٹا لکھی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا اور پھر ایک ابتری کے عالم میں: میرے باپ کا بھی وہ نام تھا جو میرے مرد کا"

لکھی کا یہ تیسرا مرد... سدھو وہاں سے اکادن باون میل دور کسی کلاری میں کام کرتا تھا، وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا، جب اس کے کپڑے کوئلے اور اس کے دھول سے اٹے ہوئے اور چہرے پر سیاہیاں کھنڈ ہوتی، کچھ تو کوئیلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا، ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا، وہ آتا تو نہایت بدصورت معلوم ہوتا اور جب آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت،

سدھو کا بھوت، بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سبھاشنی اور بیٹی کندن پنجے جھاڑ کر لکھی کے پیچھے پڑ جاتیں،

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے"؟

"... جب وہ تیری ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچوں کی...؟

"سب مرد ایک ہی رسی سے پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں..."

"مرد... لکھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی... کبھی سب غلط اور کبھی صحیح معلوم ہونے لگتا... ہاں، ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے سب مرد اسی

قابل ہیں کہ ۔۔۔ میں ایک اور کر لوں گی، مگر نہیں ۔۔۔ وہ بھی تو ۔۔۔ پھر وہ غصے میں بپھر جاتی اور اپنا ہاتھ جوتی کی طرف لے جاتی ۔ اس کے بعد سدھو کا سر اداسی کی طرف آتا ۔۔۔ نم آنکھیں، ہاتھ جوڑے ہوئے اور بکھی کا ہاتھ جوتی کی طرف جانے لگتا ۔ جب تک سدھو کا ہاتھ بکھی کے بدن پر جا پڑتا اور بکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ۔ آنکھیں چڑھنے، بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی ۔۔۔ اسے جبھی پتہ چلتا جب اس کے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا ۔ کرسچن ہونے کے ناطے بکھی میں صبر تھا اور شکر بھی ۔۔۔ لیکن کندن نہ کرسچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو ۔۔۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو سوچتی ۔ کیا ہوا اس سے، بچہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے ایک دن تو آئے گا جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والی عورت کی سوچ بچار کے افلاک پر پہنچیں گے ۔ اور مرد کے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے کا سامان کریں گے ، آخر سلسلۂ تقلیب ہی کا ہے نا ۔۔۔ مگر ایسے میں داڑھی اگ آئے گی ۔۔۔ اچھی لگتی ہے ۔۔۔

ماں گرتی پڑتی چلی آئی ۔۔۔ اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے ۔ کچھ منہ پر کچھ جھکے جھکے شانوں پر ۔ اس نے کسی قدر جلدی سے اپنے ہاتھ پیر خون سے صاف کیے تھے ، اس پر بھی بانات کی قمیص پر ایک چھیچھڑا لگا ہوا تھا جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی ، وہ گالیاں دے رہی تھی ، تیز تیز اور بے ربط ۔۔۔ اس کی آخری گالی تھی ۔۔۔ ” ایک لڑکی اور چلی آئی ۔۔۔“

کندن چونک کر اٹھی ، بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا جب وہ بکھی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی ۔۔۔ ایک لائسنس (لائسنس)

لے لو، کندنا! ۔۔۔ اب کے وہ حرامی آیا تو میں اسے گولی مار دوں گی۔"
ماں سہاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہے۔۔۔
سرجو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتی اور اس کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی۔۔۔ اور ماں سہاشنی دیکھتی، پکارتی رہتی۔ کندنا! اب آ بھی جا۔
سرجو اب بیس پچیس، فٹ لمبا ہو گیا تھا، کہیں سولہ سترہ فٹ اوپر جا کر تو اس کے تنے پھوٹتے تھے، اور پتے ہتھیلیوں کی طرح عموماً ٹکے رہتے جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی تو سرجو بیکار ثابت ہوتا۔۔۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لانبے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور کمی کی تینوں، چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، نیچے سے ننگی، پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی بھی اپنا گول مٹول اور چیچک دار چہرہ لیے پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمحے اکٹھے کرنے لگتی۔
کندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے، بندوق تو رات کے وقت بیکار بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا۔ اسلیے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خوفناک تھا۔ اور جبڑے کاٹے ہوئے جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکتی رہتی تھی، چوکیدار بہت

موڈی کتیا تھا رسدھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لیے اس سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

بچیوں سے جھگوارا البتہ مانوس ہو چکا تھا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا، اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔۔۔ وہ کیسے ہوا؟ لکھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی، اس نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔ ماں سبھاشنی اور کندن جانتی تھیں کہ ریوٹری کے بعد سدھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ لکھی نے چوری چھپے کوئی اور کر لیا ہو مگر لکھی انکار کرتی تھی، وہ یہ بات بھی ہیچ، کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا۔۔۔ نہیں دیکھا تو پھر سب کیسے ہوا؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا۔۔۔ لکھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں لڑنے لگیں۔ ماں اس کتیا کو باہر پھنکوا دینا چاہتی تھی، مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔۔۔ اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے! ماں نے خود اپنے بھائی امو نک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا، بجھایا پیروں پڑی۔ لیکن جب ماں باپ کی ہمسائی ہوتے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا۔۔۔ "اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ، میں لکھی کو نہ نکالوں گی۔" اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر رو دی۔ یہ بیٹی میرے۔۔۔ ماں کا جانا سہ سکتی ہے لیکن لکھی کا نہیں۔ لکھی اس کی کیا ہوتی ہے؟ جبھی ماں کو بھابی کے غصے یاد آئے اور

اس نے بیٹی کے پیروں پہ سر رکھ کر سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔۔۔

لیکن پھر کبھی سے وہی پوچھ گچھ شروع۔۔۔ "سچ بتا کہاں سے لائی ہے"۔ کہیں سے نہیں۔ "کبھی کہتی۔۔ اگر میں نے گناہ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں"۔

"بیٹیوں کا کیا ہے"! ماں کہتی "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے"۔

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کا جواب دیتی۔ "ماں"۔

ماں کندن کی طرف دیکھتی۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں"۔ کندن آنکھوں میں شکایتیں لئے ہوئے ماں سے زیادہ اشبھ اور ادکت والی بات نہ کہہ سکتی اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی دیکھتی ہوں "کندنی"۔۔۔ اور پھر "تو میری بات نہیں سمجھتی۔۔۔ میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں کیوں اس سنسار میں چلی آئی، کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی"!

اس بات کے مہینے ڈیڑھ کے بعد صبح کاذب کے قریب جگوار بہت غرایا بہت بھونکا۔۔۔ لیکن وہ لوہے کی موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔۔ برآمدے کے بیچ ستون کے ساتھ اسے باندھ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا مگر زنجیر نہ ٹوٹی اس کے یوں بے تحاشہ بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھوں میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے کہا ۔۔ "جگوار کو کیا ہوا آج"؟

"جانے ۔۔۔ بہت ہی بھونکا ہے"
"ادھر ہی بھونکتا ہے جس طرف سرجو ہے"
کندن نے ایک بار ادھر دیکھ لیا حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی۔ ہاں مامی! جانوروں کو وہ بھی سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔
اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جیگوار کو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سدھو آ بھی جاتا تو کیا بگڑتا۔
لیکن پو پھٹے جب منہ میں برش لئے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی اس طرف بڑھتی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور وضو، پڑھ رہا ہے جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔
"کون ہے"؟ کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکتے ہوئے پوچھا۔
فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا ۔۔۔ کندن ایک قدم اور بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا ڈایافرام کھولتے ہوئے چلائی۔
"باپ ۔۔۔"
پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر

باب کی طرف لپکی۔ باب ساکت و جامد کھڑا تھا۔۔۔ کندن اس سے لپٹ گئی۔۔۔ باب۔۔۔باب۔۔۔"

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔۔۔ وہ خاموش تھا۔۔۔ اس نے کہا بھی تو اتنا

Keep away

کندن بھونچکی رہ کر بھونڈتا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معمے لیے بابی فنش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن نکلے یا مشرق کے پرتو میں باب کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کے احساس جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا۔ "امریکہ سے کب آئے"!

"رات" بابی فنش نے دھیں سے جواب دیا۔ "ایئر انڈیا سے۔۔۔ پھر ہائیکل کی کار میں۔۔۔ کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی"۔ کیوں! کیوں آئے تم! کیا ضرورت تھی! ۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

بابی فنش جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی۔ "جیگوار۔۔۔"

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بو آگئی تھی اور وہ زنجیر تڑاتڑا کر باہر آنے اور اس اجنبی کو کچا چبانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کر نادر فنش پر چھوڑ دینے کے لیے لپکی لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سل پر یورشیں شروع کردیں وہ سلیں توڑ رہی تھی۔ باب۔۔۔ باب بولو، کچھ تو بولو۔۔۔ اور کچھ نہیں، تو گالی

ہی دو، اس سے بڑی جو تم نے مجھے دی ہے۔

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہوئے نادر فشر کی پاکیزگی کے بارے اور اس کے ولن کے رائیز پگھلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پہ کوئی لحاف سے چلے آئے جنہیں اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے باپ بولا تم عورتیں سمجھتی ہو مردوں کے عصمت ہی نہیں ہوتی۔" کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ و زاری پر اتر آئی۔

"میں نے عورت ہو کر تمہیں معاف کر دیا... باب... اور تم....

میرے اور تمہارے درمیان..... میں عورت ہوں"

اور بابی اپنا ہاتھ چھڑا کر سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگی، پکارتی ہوئی "باب... باب...."

اور جب باب نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جلتے دیکھنے لگی پھر اسے خیال آیا۔ شاید....

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا..." فا.... در...." اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باپ فشر کو نہ دیکھا تھا "بیٹا تم کس سے باتیں کر رہی تھیں" اس نے پوچھا کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی کوشش کی اور نیچے دیکھتے ہوئے بولی اپنے آپ سے...

مکھی یہ اب تک ان سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ سچ بتا کون تھا!۔

۔۔۔ کہاں سے لائی یہ الجھن کی گانٹھ ؟

"تم تو یہ مت پوچھو ماں"

ماں ایکا ایکی ڈر گئی ۔ اس نے بیٹی کے چہرے پہ دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کندن نے بالقصد چہرے پہ ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا، ہم عورتیں ہیں ۔۔۔ ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ماں کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بچہ ہے ۔۔۔"؟

" اگر پھر لڑکی ہو گئی تو "؟

" لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی " ؟

" ہوتی ہے مگر ۔۔۔"؟

اور پھر سب باتیں ان سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور نہ کبھی دے سکے گی، دے گی بھی تو اس پہ ہزاروں دباؤ ہوں گے، سماجی اخلاقی اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہو گا، ماں ڈری سہمی رہے گی۔

گرجے میں لکھی نے "کنفیشن" کیا تو ایک اور صورت پیدا ہو گئی جس نے نادر ماٹیکل، نادر ردبیلو، سسٹر ٹیریزا انجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا بابی فنڑا بھی تک چپ اور دم سادھے ساری باتیں سن رہا تھا۔ لکھی نے کہا" وہ خواب میں آیا تھا"۔

اس پر معاملہ ابتر ہو گیا "کون" ؟ سسٹر انجیلا نے پوچھا،

کندن بھی وہیں تھی اس نے لکھی کی مدد کرنے کی کوشش کی "سدھو"

اس نے کہا۔ مگر لکھی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ لکھی نے اُچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا... پھر آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی،

"رام داس"

کیتھی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا...

لکھی قسمیں کھا رہی تھی بن پڑی، یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے عشائے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کندن نے سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا "خواب میں آیا تھا... کیا یہ ہو سکتا ہے، سسٹر"، سسٹر انجیلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مبہم سا جواب دے دیا۔

"کیوں نہیں، ... سچ کہتی ہے، لکشمی رام داس"

فرداً فرداً فادر روبیلو اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیئے گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پر کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا "کیا یہ ہو سکتا ہے ...؟"

فادر فشر نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کندن سے کہا "نہیں"

کندن چونک گئی اور بولی "فادر... تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے"

"نہیں"

"کیوں نہیں...؟"

اِس لئے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے... میرا خیال ہے رات کے ذلّت سدھو چپکے سے چلا آیا ہوگا" کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا ... اپنی کے سب کام پر ماتا اندھیرے میں کرتے ہیں" مگر فادر فشر کو آخر حد تک پہنچانے کے لئے کندن بولی" سدھو یا رام داس"؟

" سدھو"

" رام داس کیوں نہیں"!

رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا ... اس کا کوئی وجود نہیں، وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں"

" ہاں مگر" کندن نے ضد کی" آیا بھی تو کسی کو پتہ نہ چلا"!

" تم تو جانتی ہو" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا" یہ خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے"

" ہاں جذبات سے معمور ہو گئی" باب" اس نے کہا" اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی ..."

" باب فشر نے کندن کو وہیں روک دیا صرف اتنا کہہ کر" نہیں"۔

" تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے باب! اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو جاتا ہے، یسوع"

باب نے پھر ٹوک دیا" تم نہیں سمجھ سکتیں"

اور فادر فشر ایک ایک قدم سے دو دو سلیٹیں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا۔ پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے رات کو اپنے مجرد بستر پر سونے

اور روز آدھی رات کو اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے ۔۔۔۔ اس کے کچھ دیر بعد فادر فشر نیشہ کے لیے لیڈیسن وس کو بن چلا گیا۔

اب کے زچگی کے سلسلے میں لکھی کو بہت کڑی ہدایات تھیں۔ کندن نے ایک سستی مگر چست چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا، اور وہاں کے اسپتال کی بیڈ بعض وقت ارجنٹ کیس کے لیے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹرنٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکھی میں ہمت نہ تھی، کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک۔

لکھی زچگی کے سلسلے میں کوئی مصارف برداشت کرنے کو تیار ہی نہ تھی ۔۔ ماں سہاشنی نے بیخ پا ہو کر کہا۔ "مر جائے گی کمینی ۔"

"ٹھیک ہے" ۔۔ لکھی نے کھرا سا سر ہلا دیا ۔ "چھٹی ہو جائے گی۔"

"ان چھوکریوں کو کون سنبھالے گا؟"

"خدا جس نے پیدا کیا۔"

"انہیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور ناک تک بھری ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ وہی ہے جو وقت پہ عقل پھرا دیتا ہے، کسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا لیکن چیتی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ کر رحم آتا تھا، وہ اب تک

ماں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی۔ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد مکھی اسے نہ پوچھے گی، اس لئے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھی ہونے کے کارن اسے فرصت ہی نہ ہوگی، اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہوگیا تو...... نہیں اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا یہ مکھی جانتی تھی اور ماں سہاشنی اور کندن بھی۔

دایا دن میں ایک دو چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ مکھی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وقت بنا گیا تو مکھی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کر اسے دیئے جائیں گی اور میم صاحب کندن بیس روپے اپنی جیب سے دے گی، ساتھ میں دھوتی، بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈ اسکرٹ۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو مکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پہ کوئی ہنسے، مگر... اس کے تھوڑی دیر بعد مکھی پھر کھلکھلا کر ہنس دی دایا اس کا منہ دیکھنے لگی اور ڈر گئی۔۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنڑی عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہوگئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ لیکن مکھی۔ بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی، مکھی کی ہنسی سے دایا مایوس ہوگئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دایا کے جاتے ہی لکھی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی جتنا وہ ہنسی تھی، وہ ایک ایسے جری پن سے جو عورت ہی کا حصہ ہے اپنے درد کو دباتی رہی۔ حتیٰ کہ شام کے سات بج گئے،

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی، اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ ماں رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لئے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

"یہ ___"؟ ماں نے کہا،

"لکھی کی آواز ___" کندن بولی اور پھر دونوں اندھیرے میں لکھی کے گھر کی ۔ طرف دیکھنے لگیں۔ "ہائے سرب ناش" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا، "دایا تو کہہ کر گئی ہے ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں" اس کے بعد اور بھی ہو وہائے سنائی دینے لگیں، ماں بھاشنی کی بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا ___ بیچ میں جیگوار کے بے تحاشہ بھونکنے کی آواز بھی شامل ہو گئی۔

لیکن رک گئی۔ اس کا انگ انگ بھڑک رہا تھا اور چیخیں سنکر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور ماں کے ڈر سے رک گئے ___ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں ریوڑی چلی آئی ___ روتی ہوئی، متوحش اور مادر زاد ننگی ...

"کندن" ماں نے آواز دی "میں کچھ کھا مروں گی"
اس پہ کندن نہ رکی اور کوارٹر کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے بھائی اموک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لیے بھیج دینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ آنا اسے ماں کے مرجانے کی پرواہ بھی نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا، کندن کا اور لکھی کا! سبھاشنی اٹھی اور اپنی کچی کنواری" بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے لئے ڈیوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

لیکن ماں سبھاشنی پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، کندن کو روک لیا" اگر تو جائے تو میرا مرا منہ دیکھے"۔

وہ گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی رہیں۔ کہیں نو ساڑھے نو بجے تولید ہوئی حرامی بچہ پیدا تو ہو گیا ۔۔۔ لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑکا تھا۔

پیدائش کے فوراً بعد حیات و ممات سے بے خبر لکھی ایک تسکین کی میٹھی نیند سو گئی تھی جس کا احساس اس جانکاہی کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کندن کو یاد آیا۔ لکھی نے ایک بار کہا تھا۔" خداوندا! میں ایک لڑکا تو پیدا کر کے دیکھ لوں چاہے وہ مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔"

فادر مائیکل نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کرشچین بنے بغیر مر گیا تھا، وہ زندگی میں شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن اس کی اصل وجہ نہ فادر مائیکل نے بتائی نہ فادر ردبیلو نے

اور نہ سسٹر انجیلا نے

ماں نے بنگلے کے دوسرے کونے میں گڑھا کھودا، مردہ بچے کو دبانے کے لئے لکھی گھسٹتی ہوئی قبر تک چلی آئی۔ گھر سے شراب کی بوتل کا کھوکھا لے جسے بچے کا تابوت ہونا تھا۔ کھوکھے میں ڈالنے سے پہلے لکھی نے بچے کو دیکھا اور جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔ اور پرے دیکھنے لگی۔ وہ رو بھی نہ رہی تھی جب تابوت کو قبر میں رکھ کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ لمحوں کا ایک ڈھیر بن گیا ایک ٹیلہ سا۔ لیکن کندن کہاں تھی۔ تھوڑی دیر میں کندن چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں سرد کا ایک پودا تھا جسے وہ جڑوں سمیت کہیں سے کھود لائی تھی۔

"یہ اس پہ لگا دو، ماں۔"

ماں کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی۔ اس نے ایک تیز نظر سے یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی آنکھوں میں — اور پھر اپنے مٹی سے اٹے ہاتھوں کے ساتھ بیٹی سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد سب باتوں سے فارغ ہو کر ماں سبھاشنی نے کہا "بیٹا، اب تو شادی کر لے۔"

کندن نے ماں کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا "تم نے کیوں نہ کی، ماں؟"

"تم جو تھیں ۔۔۔۔ میرا سب کچھ۔"

اور کندن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

٭ ٭ ٭

بکی

"۱۶"؛

، جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۱۶، تیسری قطار میں' بکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا۔" آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاحب، کنڈکٹر آپ کی مدد کرے گا۔

"شکریہ، شکریہ" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چونی کونٹر پہ رکھ دی، چونی جیب میں ڈھلاتے ہوئے بکی نے آنکھیں بند کرلیں جیسے اس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی اور رات کو اس عظیم الشان سینما میں ٹکٹیں بیچا کرتی تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لیے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کر دینے کے عوض اسے چونی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، ہٹیلی ماں تھی جو کھانا ملنے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی ۔ ۔ ۔ اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ آگ جلانے سے پہلے وہ تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی، اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھانجے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کچھ دیر بعد معمولے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کونٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کونٹر پر بجائیں اور بولا "لیکن مادم ۔۔۔۔ وہاں تو کوئی لڑکی نہیں "

بکی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "کہیں باہر ہوگی صاحب ۔۔۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے ۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا ۔

" اُف " نوجوان نے بزاری سے کہا ۔ ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے مس سام ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے "

پھر وہ لڑکا کچھ دور جا کر ساگوان کے خوبصورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے ٹلز کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے آج شب کو سرخ لیبل پھاڑنے شروع کر دیئے ۔ پھر بکی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا " مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے ۔"

بکی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دل ہی دل میں اس کے خوبصورت بالوں کو سراہنے لگی ۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال ، دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنجا نہیں نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا ۔ بس ۔۔۔ ٹھیک ہے ۔ اور اس کے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنھوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو ۔۔۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے ، حالانکہ شاید اس نے شراب نہیں پی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے ، جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بو آنے لگتی ہے ۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے سے اٹھا کر بڑے غور سے سینما کی چھت کا معائنہ کرنے لگا، چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوبصورت دکھائی دیں گے چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہوگا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہے گا ... ستارے کتنے خوبصورت ہیں اور ... اور یہ سچ ہے کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں دوڑائی تھی اور نہ قدرت کے اس کمکشہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا، پسند کیا تھا، لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس لیے پسند کرتا تھا کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا، کی کو یقین تھا کہ وہ اس بے فکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی، البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی، اور شاید اسی لیے وہ اس کے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی، ورنہ اس کے لیے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے ہاؤس فل کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر جا بیٹھتی۔

برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا۔ اس لیے نوجوان کے کپڑے

کسی قدر آلودہ ہو گئے لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا۔ گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کے بجائے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا جو دائیں دیوار سے ہٹا کر مینجر کے کمرے کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا جہاں سے وہ اٹھا لی گئی تھی۔ بکی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھا لی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لئے اسے ۲۴ پر گنہ کے دیہات میں گذارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے ہیں، وہ دن جب کہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوان کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اسے چونی ملتی تھی۔ اس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ دور نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا... جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا

ہو۔

چھبیس ...... ستائیس ... چوتھی قطار ...... بارہ ......

...... بجی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تھی ...... مسز وسوزا ...... خاہ! اس کے ساتھ مسٹر وسوزا نہیں تھے، وہ تھے یا نہیں تھے، بجی ہلکی ہلکی سردرد میں بالکل بھول چکی تھی۔ اسے تو ان کی شکل تک یاد نہ رہی تھی۔ بجی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا تھا کہ وہ اس چوٹی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لیے ملتی تھی۔

" خنٹلمین" بجی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا" میں نے آپ کی سیٹ چوتھی لائن میں تیرہ پر رکھی ہے اور بارہ پر مس وسوزا کی جگہ ہے" بجی نے جان بوجھ کر مسز کر مس کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا، اور پھر بجی کو اپنی جوانی عزیز تھی: اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔

...... نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا" شکریہ"... اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

بجی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر پلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ اپنی رڑے کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک بدصورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بجی غور سے اس کے چہرے کی طرف

دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کم سِن تھا اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا، البتہ جاننا چاہتا تھا، ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا جو کہ اس کے چہرے کے بھولے نقوش کو اور بھی ابھار رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بکی کی طرف سرکاری بکی کا منہ کھلا رہ گیا۔ "تم چاہتے ہو۔۔۔" بکی نے وہ لپولی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے پلین پر جھک گئی۔ ہاؤس فل تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوبصورت نوجوان کے لیے پہلے بک کی تھی۔ لیکن ساتھ کی سیٹ پر لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ بکی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہوگی۔ کتنی خوب صورت تھی وہ لڑکی۔۔۔ وہ بلانڈ، اور اس کے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گذر رہی ہو۔۔۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لیے بنائے تھے۔۔۔ اس کے پہلو میں اس بے وقوف، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس کی توہین کرنا تھا اور یہ چھوکرا نو آموز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہہ دے سکتا ہے، وہ

وہ گدھا تو اعلیٰ ستاروں کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کاٹتا اٹھ کر کلکتہ چلا آیا تھا،

نوجوانوں کا ایک غول اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا لیکن نشستیں رک چکی تھیں۔ پلیٹ سارے کا سارا بکی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس وجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان اپنے اوورکوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے،

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد موسم سرما کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایگزٹ ؟ کی طرف آ کھڑی ہوئیں ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیئے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے،

اس وقت بکی کے سامنے اس دیہاتی نوجوان کے لیے ایک عجیب مادرانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے ہاؤس فل کا تختہ لٹکا دیا۔ اور خود کھڑکی بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دیدیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کنڈیکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ

نمبر کی نشست پر بٹھا دیا، بکی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی ۔ بلانڈ نے گھبرا کر اپنی بائیں طرف دیکھا ۔ اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا ۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہونے میں کوئی شک نہ رہا ۔ بکی نے سوچا ۔ شاید وہ لڑکی بھی میری طرح رابطِ حسن کی بجائے اپنی چولی یا دس کے نوٹ کو پسند کرتی ہو ۔ اس کے بعد پردے چھٹ گئے اور سینما شروع ہوا ۔ انگریزی فلم ،" میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے ،" شروع ہوئی اور گانا ایک دلفریب ٹیون پر گایا جانے لگا ۔

تاروں بھری رات کے نیچے ،

بکی نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی " تاروں بھری رات کے نیچے لیکن ابھی دوسرے شو کا پلین بنانا تھا ۔ اور اسے تین ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ چکے تھے ۔ اب تو وہ بہت ہی تھک چکی تھی ۔ اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لیے اسے ہال کا اندھیرا پسند تھا ۔ وہ سوچنے لگی ۔ تاروں بھری رات کے نیچے کا دلفریب گانا سن کر اس بدصورت نوجوان کو کیا خوبصورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت ؟ یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے ؟ اس کے بعد بکی باہر نکل آئی کنڈکٹر جانتا تھا کہ بکی اسی جگہ کھڑی ہو کر لمحہ دو لمحہ کے لیے پکچر دیکھا کرتی ہے ۔ اور پھر فوراً ہی مضطرب ہو کر باہر نکل جاتی ہے ۔ گویا پردہ سمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا

رہا ہو، حالانکہ یہ بات نہ تھی ۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن سکتی تھی، اسے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے، اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا، وہ اتنا چھلکتا ہوا دل لیکر باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارا اسے یاد آجاتا، جہاں اس کی محبت پروان چڑھی اور لٹ گئی، جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں، اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے لیپا کرتیں اور بکی کا جی چاہتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کونے میں صبر و سکون سے پڑ رہے، اور ان ہی عورتوں کی طرح چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کرے،

وہ مینجر کے کمرے کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی، کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی، ہاف ٹائم ہو چکا تھا، بکی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور اس کے ساتھی کی نشست کی طرف دیکھا، وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لیے ویسے ہی اجنبی تھے، اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے، اگر وہ چھوکرا طریقے سے اس خوبصورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا،

اب ہاف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا لیکن وہ باہر چلا آیا اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔

ہلو مس ۔۔۔ مام اس نے باہر نکل کر دوڑتے ہوئے کہا۔

بکی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ہلو ۔۔۔ بوائے، انجائیڈ اٹ (کہو، خوب لطف ملا نا)

اس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔ مام ۔۔۔ میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ اس کے بعد وہ ہکلانے لگا، میرا چچا گدار پور میں دکان کرتا ہے۔"

بکی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا اور بکی بھی یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا، وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی، وہ بہت رحم دل تھی، اس کے بعد جب شو ختم ہوا تو بکی نے مینیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی بدصورت جوان باہر آیا بکی اس کے قریب چلی گئی، بولی،

ہلو بوائے ۔۔۔ تم کہاں کا رہنے والا ہے؟

"برش پور ۔۔۔ ۲۴ پرگنہ کا۔"

"میں جانتی ہوں برش پور ۔۔۔ میں ایک دفعہ ستر روپے کے ہال ایک ماہ ٹھہری تھی،

رہے ؛ ہاں، ہاں ۔ لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا۔ میں رہے کو

جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا۔ آپ اتنی مہربان کیوں ہیں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"ملنی" بچی بولی ۔۔ لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں انہوں نے ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی، وہ لڑکی میری ماں ہے ۔۔۔ اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتے ہو۔؟

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی ہوٹل چلیں ہم کافی کی ایک پیالی پئیں گے۔"

اور وہ دونوں فرلپو کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا بلب دور سے چاند کے مانند دکھائی دیتے تھے، مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔۔ دور سے اصل چاند کا دھوکا ہوتا ہے۔ نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔ بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دودھ کے مٹکے چڑھا جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا، لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے

تھے ۔ مارگریٹ پوچھتی ،

"یہ کیا چیز ہے ؟"

"نامعلوم ۔"

"سلایج ۔۔ کہو سایج ۔"

"سایج ۔"

"یہ کیا ہے ؟"

"نامعلوم ۔"

"کٹلس ۔۔ کہو کٹلس ۔

کٹلس ۔"

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا تو مارگریٹ اسے درست کرتی ، جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نام لینے سکھاتی ہے ۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے تو اسے درست کرتی ہے ۔

کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا ۔ لیکن اس لڑکے نے تھام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دیئے ۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہوگا ۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس بات سے تو واقف تھا ۔ ایسے ہی جیسے سینما میں چونی زیادہ دے کر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا ۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر یا کھانا کھا کر اس

کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہو گا۔

مارگریٹ نے بتایا۔ کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

بوائے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے؟ ۔۔۔ میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی۔ یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے۔

میں تمہیں بتاؤں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا، جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا، یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے ۔۔۔ ہاں تم اس عورت کو دیکھ لو گے، جو کلکتہ میں ہے"۔؟

* * *

دیوالہ

روپ متی، میری نند جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کی نشانی اس کا بدن ہی نہ تھا، اس کے لچھن بھی تھے..... وہ اس کا چونک چونک کر بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے وجہ اداس ہونا، شک کرنا اور پھر سب سے بڑی بات بیکار کی راز داری۔

مجھے دنیا کبھی اچنبے کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی بڑا بھید دکھائی دیا، ہاں بارہ ساڑھے بارہ کی تھی، جب میرا بیاہ ہو گیا اور میں مندروں کی اس بستی، دیولی نگر چلی آئی..... یہ نیچے چھتے گھر ہیں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا پھاٹک ہے، سب تبھی بنا تھا۔ ہاں لوہے کے یہ موٹے موٹے کیلے بعد میں گاڑے گئے تھے، اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی، یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں بیاہی ہوا محل کے اس چھجے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا کھوٹا مجھے خود بُرا لگ رہا تھا۔ سسر، جیٹھ وغیرہ بھی پیڑھی پر گئے تھے، ودا بھی پیڑھ نام کو نہیں سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ، بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتہ تھا کی ارنڈی قبضے میں کرنے گئے ہیں، ایک بار اس پر قبضہ

سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا، اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے ۔

کھانا پینا گھر، یہاں سبھی فنِش کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھانا پکانے کے علاوہ اور کیا تھا ۔۔۔ سویرا ہوا تو ہم سوچتیں، کیا پکے گا؟ دوپہر کو تھوڑے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بعد، شام کو کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے، گھوم پھر کر ادھر اور ادھر ہی پہنچتا ہے تو یہ دیدا کیسی؟ وہی روز کی باتیں، روز کے آدمی، ساس میری دیکھنے میں بری نہیں تھی ۔ لیکن کبھی کبھی بھنگو ہی اِک اچھی لگنے لگتی ۔۔۔ اس لیے جب گھر سے جی بھر جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی ۔ تم نے دیکھا ہے نا، بالو کی ماں، یہ بخارچہ نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے، لیکن ہے راما کا پشت پوان، ایک اٹھ کلیا کمل، لال سمینٹ کا جیسے تھامے کھڑا ہے، گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر پار دکھائی پڑتا ہے، بھنگن چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرتے والے مزدور، یوں غریب، پر بدن پر محنت کا سرور، چہرے پر صحت کی چمک، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان پھوٹتے جا رہے ہیں، اس بات کی بھی پروا نہیں کہ مجوری ملے گی یا نہ ملے گی، پھر آنے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی ابلتی رہتی ہیں دوسروں کو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانوروں کو زیادہ نے آپ کو سب سے زیادہ اور اس پر بڑے خوش مارا ماری کرتے جا رہے تز جیسے سویرا پورب سے کرنیں چھٹکتے ہوئے امنڈتا ہے، اِدھر ھر چابک، لوگ یوں ادھر ادھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا اپر اوھ دل

ہوتے ہی کوٹھریوں میں میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے۔ بنیم، دلال، سٹے باز دھوتی کا پلو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو بیچ سڑک کے جا رہی ہیں اپنی لائن میں ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا اور پیچھے مانس کے لودے چلے آتے ہیں، جیسے کسی نے بڑے بڑے تکیے باندھ دیئے ہوں، چلتی ہیں تو پیچھے سے بدھ دیر بدھ دیر کا جاپ ہوتا ہے، پرساد کی تھالی ہاتھ میں، پانڈے جی ساتھ ہیں، دنیا جہاں سے بے خبر، برائے نام گھونگھٹ کاڑھے، پتہ نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں، بڑے سے بڑا لوہے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا۔ پھر اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری جن کی ٹنڈیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ والوں کی تھیلیاں، جن کی ڈوریاں تک کمر میں بندھی دکھ رہی ہیں، تس پر بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں، گھورتے مشٹنڈے بھی ہیں لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑتے والا پیار اور آشا، دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں کبھی تو ان سے نہیں شرمائیں، شرمائیں کن سے!

ایسی باتیں دیکھ کر جی اور گھبرا جاتا ہے، پھر میں سامنے دیکھ لیتی ہوں۔ پورا مارواڑ دکھائی پڑتا ہے۔۔۔ پتھر ہی پتھر، ریت ہی ریت۔۔۔ سورج کی روشنی آڑی پڑتی ہے تو ریت کی کنی کنی دمک اٹھتی ہے۔۔۔ معلوم ہوتا ہے ان گنت ہیرے پڑے ہیں اٹھا لو اور سارا اندر باہر سب بھر لو۔ دیش بھر کا سونا روپا اس دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی جھوٹی چمک دمک ہے۔ ہریالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا ٹیل دوب دکھائی دے جاتی ہے لیکن پیڑ نام کو نہیں۔۔

دور وندسپیا کے آنگن میں کوئی ٹھنا کا پیڑ کھڑا ہے یا چنبیل کے کنارے کچا سل سرلا رہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ۔ اوپر ایک گپھا سا ہے وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب سونا لے لے اور تھوڑی ہریالی دے دے ماں ہتی میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں ٹھینگے کی طرح ... اس کا کہنا ہے کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا، کھڑکی میں بیٹھی ہے تو گنگا بس کہتی ہوں، یہی حساب تو پھر ہماری طرح سبھی گھریلو عورتیں گنگا دیتا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں ... بے تابالو کی ماں ! کھڑکی کے لیے عورت ہو نہ ہو، عورت کے لیے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اس دن ہمیں کون روک سکتا تھا؟ گوکل اشٹمی کا دن تھا۔ گوپیوں کے کاہن آج کے دن پیدا ہوئے تھے، رادھا بازار میں بڑی گھما گھمی تھی، رام رام ساری لوکائی امنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی ... سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بھی بہت تھیں جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو برا منہ بناتیں، اوپر سے گالیاں دیتیں بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں۔ یہ عجیب بات ہے ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں، آخر میں وہی کرتی ہیں، ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں لیکن ہمارے من کا پیاسا الو کھا ضرور ہے ہر دل کو اس بات کا کیا پتہ، وہ تو سارا پڑھ لکھ کر بھی جانگو ہی رہتے ہیں بس سیدھے فلاں کام کرو، نہیں تو ہم جان سے مار دیں گے یا خبردار جو سادھرتی کے ساتھ منڈوے کو گئی، وہ اچھی عورت نہیں ہوٹلوں میں جاتی ہے، کوئی پوچھے

تم کو کیسے پتہ ہے جی، نہیں جانتے۔ جتنی دیر میں ان کے من میں ایک وچار آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کر نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں، رجرت مرٹت، رنگ، بانکڑی اور گہنوں کی نمائش تھی، سب ایک عجیب خواہش سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔۔۔ پلو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے کو لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں، جو گھر کے بھیدی نے باہر لٹکا رکھی ہیں تاکہ باہر کا چور ان کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کو دو پڑے پھر کیا ہے، سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس ہے، ہمت ہے تو توڑ لے،

کہاں تو اکیلے ہی بیٹھی تھی، کہاں روپ متی، ساس، دوا، بھی آ گئیں جبھی پتہ چلا دوا تو کب سے آ بیٹھی تھیں۔ اندر کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھیں، دوا اور ساس دونوں باہر دیکھ رہی تھیں لیکن چہرے پر کوئی اثر نہیں، منہ بیرنگ لفافے کی طرح، جیسے دوا اور پھاڑ لو نہیں تو بھیجنے والے کو واپس وہاں ردپو کا منہ کھلا تھا۔۔ میں نے کہا، ردپو! تو ادھر آ جا میرے پاس۔"

بولی "نہیں بھابی میں ٹھیک ہوں۔"

پیچھے سے دوا بولیں۔ ارے! پیار سے بلاتی ہے، جاتی کیوں نہیں"؛ ردپو نے شک بھری نظر سے میری طرف دیکھا جیسے مجھے اس کی کسی بات کا پتہ چل جائے گا، میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گا اور وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی، میں نے اپنی بانہہ میں جو اسے جکڑا تو پتہ چلا کہ اس کے کولہے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی ردپو کچھ بھی نہیں تھی۔ اب بھی

کچھ ہے۔ ابھی تو میں نے اس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی، کہ ساس کی آواز آئی "بہو سر ڈھک اپنا، کیسے بیٹھی ہے"!

میں نے اسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں بالو کی ماں، مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے سر پر کپڑا نہیں ہے، ننگی ہی بیٹھی ہوں ان عورتوں کی طرح جو سامنے بنجارے میں کھڑی تھیں، اور تن من سبھی کو ہوا لگ رہی تھی۔ میں پھر دونوں ہاتھ یہاں کھڑکی میں ٹکا ان پر ٹھوڑی رکھے نیچے دیکھنے لگی۔

نیچے عورتیں تو اب کہیں کہیں تھیں، مرد ہی مرد تھے چھیل اور۔ کوئی لمبا کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا، کوئی موٹا کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفا چٹ۔ لیکن سر کے بالوں کے گھونگھریا کندھے پر پھینک رکھے ہیں، کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے، کوئی بیڑی کی راکھ چٹکی سے گراتا ہے، کوئی لڑتا ہے، کوئی گالی کھاتا ہے، لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں بجلی کے تاروں کی طرف۔۔

اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے، ایکدم یہ اتنے کہاں سے چلے آئے پھر میں نے سوچا، آخر ماؤں نے ہی جنے ہیں، آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے۔۔۔ بیچ میں ایک ٹھٹھ سا بندھا تھا اور باقی سب کے سب اس کے چاروں طرف گھیرا بنا کر کھڑے تھے، ان کے سروں پر کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسی لٹک رہی تھی، جس کا ایک سرا نگر ڈول کے گھر اور دوسرا چھندواڑے کے سیٹھ کے یہاں بندھا تھا، اور اس رسی کے سہارے بازار کے بیچوں بیچ مٹکی لٹک رہی تھی، یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن رکھ دیا کرتی

تھیں، اور اوپر ٹانگ دبتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں نٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے گا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر چڑھ کر پہنچ ہی جاتا تھا۔

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر، دوسرا اول آیا، تین آدمیوں کا اور پہلے چھ آدمیوں کے کندھوں پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر ہی بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک نوجوان لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب کے کندھوں پر یوں چڑھ گیا جیسے وہ آدمی نہیں، سیڑھیاں ہوں۔ اوپر پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیض میلی تھی اور اس پر رنگ گرا ہوا تھا۔ بٹن کھلے تھے...... میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔ میرا دل دھڑک اٹھا، اس لیے کہ ابھی کہ اس کے پاؤں ابھی جمے نہیں تھے، وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پاؤں تھرائے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پاؤں جم چکے تھے۔

لوگوں میں ایک شور سا مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھے اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی، ایک بجلی سی میرے شریر میں دوڑ گئی، پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیئے اور سر بل اوپر اٹھا، ہاتھ ملائے کانپا سنبھلا... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے خون میرے منہ کو آ رہا ہے، میری کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر میں اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا، اب اس نے دونوں ہاتھوں میں اسے تھام رکھا تھا۔ اس

نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی، روپو بیٹھی تھی، ساس اور دوا بیٹھی تھی مجھے ایسا لگا، جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے، میں نے اسے دیکھا ہے لیکن نہ جانے کتنی پرانی بات ہے جیسے وقت نے تصویر کو دھندلا دیا ہے، ریکھائیں سی رہ گئی ہیں،

... میں نے چور نظر سے روپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی، جیسے بچے تماشے میں منہ کھول کر بیٹھتے ہیں، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے، اس میں سے سینک نکل رہا ہے، مجھے یقین ہے مجھ سے بدبو اٹھ رہی ہو گی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں،

اب تک میری جیٹھانی تھی، ایک میں تھی جس کے یہاں لاکھ جتن کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا، اور ایک وہ تھی ہر سال جس کے ہو جاتا تھا اور جسے وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی، اور ایک وہ جسے ہر چیز گندگی سے پٹی معلوم ہوتی تھی، ہر وقت ہاتھ، منہ، کپڑے دھوتی رہتی تاں کر نل تب، اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی، ہاتھ تولیے سے نہ پونچھے تھے کیونکہ گھر میں ہر آتا جاتا اسی تولیے کا استعمال کرتا تھا، آکر اس نے گیلے ہاتھ جو جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پر یوں پڑے لگا جیسے اوڑھنی زمین پر برکھا کی پہلی بوندیں پڑی ہوں،

... میں نے مڑ کر دیکھا، روپو جا چکی تھی، شاید میرے پاس بیٹھ کر اسے سینک لگ رہا تھا یا پھر وہی اس کی سیدھی حرکتیں! کبھی پتہ نہ چلا اس کا، اگلے پل کیا کرے گی۔ اتفاق سے نظر نیچے گئی تو وہ اسی ساج کے پھاٹک کے باہر کھڑی تھی اور

اشٹمی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی، جس میں وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا لیکن وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی، آخر میں وہ اسے مکہ مارنے لگا۔ جب اس پر بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ مجھے کیا ہوا میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں موند لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے۔

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو ضرور کچھ چوٹ لگی تھی لیکن چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے ایک میلا کچیلا رومال نکالا اور گردن پونچھ لی پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اترنے لگا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ نیچے کے گھیرے پر پہنچ کر وہ لڑکھڑا گیا، وہ گرا۔۔۔ میں لپکی لیکن ان گنت لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہنس دیا۔ ساس نے ناک بھوں چڑھائی۔ میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یوں ہی مورکھوں کی طرح اس طرف دیکھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا، نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں، کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ لیکن۔۔۔ میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی؟۔۔۔ من کو مار کے یہیں بیٹھی رہی اور سوچتی رہی،

رات آگئی، اشٹمی کی رات۔ میرا من تب تک بہت بوجھل ہو چکا تھا۔ تن کا تو بڑ دد ہرا نہ کیا تھا۔ پر اتنا تھک گئی تھی کہ بس۔۔۔ آج گھر میں ایک چیز کام کی ہوئی

اور وہ یہ کہ ارہر کی دال نہ پکی تھی اور نہ اُرد کی، نہ کڑھی، میری جیٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی پکائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی، بالکل ماس کا سواد تھا، ہاں، بابو کی ماں، تم سے کیا چھپانا؛ میں نے مانس کھایا ہے، چوری چوری کئی بار کھایا ہے،

روپا آ گئی، ویسے ہی پے دبے ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اٹھنا دوبھر ہو رہا تھا، لیکن وہ تھی کہ اپنے ہلکے پاؤں پر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھسلتی جا رہی تھی۔ آتنی چھک اس میں کہاں سے چلی آئی میری طرف شرارت سے دیکھ کر مسکائی اور بولی،

" بھیا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی"؟

میں نے کہا۔ "کیوں"؟

روپا سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پر میں شرما جاؤں گی، جیسے دوسری عورتیں اپنے پتی کے نام پر شرماتی ہیں، لیکن ہمارا بیاہ کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی آنی بات ہی کہاں رہی تھی،

روپا بولی، پتہ بھی ہے آج ہنڈرے ہیں؛ وہ جھونٹا دیتی کہ آسمان سے جا لگتیں،

اونہہ میں نے منہ بنا کر کہا اور چپ ہو گئی،

روپا جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیا کو جھولے میں بٹھا کر بہت خوش ہوتی تھی، پتہ نہیں اسے کیا مزہ آتا تھا، شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ رادھے شیام کی جوڑی ہے، جب لمبا اور تیز جھونٹا دیتی تو میں ڈر کر اُن سے چمٹ جاتی اور روپا دیکھ کر

بہت ہنستی، بیچ ہی میں وہ ایک بار گر گئی اور یہ مجھے تھام نہ سکے۔ میری جیٹھانی کے بچوں نے بیر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھی۔ ایک میرے سر میں گھس گئی۔ تب سے میں نے جھولے ہنڈولے پر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بٹیٹی بھی تو ان کا سہارا لینے کے بدلے رسی تھام لیتی جس سے روپو کے سب تماشے کا تماشہ ہو گیا۔

روپو بیٹھی رہی اور طرح طرح کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگتی کبھی باجے میں فلمی ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ساتھ ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔۔۔۔ تب تک ان کے پتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے میں جانتی تھی وہ ساسس اور جیٹھانی ہنڈولے دیکھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی، اب سانول داس کے دیول جاتے کے لیے کسی نے کہا تو کیا بہانہ کرونگی! تبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا جس نے ٹمکی چھوڑی تھی

"روپو تو نے دیکھا تھا آج کا جلوس"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "ہاں بھابی۔"

مَیں نے پوچھا۔ "اور وہ نرپالی دیکھی تھی۔"؟

روپو بولی۔ "ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے تیز نظر سے مجھ کو دیکھا اور چپ کھڑی رہ گئی۔ میں کچھ نہ سمجھی۔ الٹا میں ہی پوچھنے لگی۔ "کون لڑکا بھلا"؟

رو پو نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا، "مجھے کیا معلوم"؟

"ارے دہی"! میں بولی، "مٹکی پھوڑ..........."

اور صرف روپو کو چھیڑنے کے لیے میں نے کہہ دیا، "کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا۔ اشارہ کرتا تھا، جیسے اچھی طرح جانتا ہو"۔ میں چاہتی تھی، روپو مجھے چھیڑے، مجھ سے کہے۔ "وہ تمہیں بلا رہا تھا، بھابی"..... لیکن روپو چپ رہی۔ نہ صرف چپ ..... اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا، جیسے میرے اندر کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی گھبرا گئی۔ پر میں نے سوچا کہ میں نے کیا کیا ہے، جو خواہ مخواہ کی چور بنوں، میں نے دلیری سے روپو کو اور بنانا شروع کر دیا، جب وہ بہت گھبرائی تو میں سمجھی، اس کی تو عادت ہے۔ مجھے کیا پتہ، آج کیا ہونے والا ہے؟ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا، کیسے سر مار مار کر مٹکی پھوڑی تھی اس نے"؟

روپو اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی، میں نے دیکھا، بغل سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی، اور اس پہ خون کے کچھ دھبے تھے..... روپو سال بھر سے رسبوّلا ہو گئی تھی، میں نے من ہی من کہا، وہ پھر شروع ہو گیا ہے، اور یہ پھوہڑ نہیں جانتی۔"

"دھوتی تو بدل کتیا"، میں نے لفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا، "پھٹی پڑی ہے، سب خون لگا ہے"۔

روپو کچھ مڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں کو چھپاتے ہوئے بڑبڑا کر باہر نکل گئی۔ میں نے اس واقعہ کو کوئی ایسا نہ

سمجھا ایسا تو لگ بھگ ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ عورت بنتی ہے، ہولے ہولے وہ اپنے آپ کو سنبھالنا سیکھ لیتی ہے، کئی تب بھی پھوہڑ ہی رہتی ہیں ..... میں نے سوچا یہ بھی پھوہڑ ہی رہے گی، روپو۔

رات کو جو کچھ ہوا اس سے مجھے پتہ چلا، یہ سب جادو "کتیا" کے الفاظ نے جگایا ہے، مجھے کیا معلوم، بابو کی ماں، تو تو جانتی ہے، ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسرے کو کتیا کہا کرتی ہیں۔" میرا مطلب یہ تھوڑی تھا، ہم بنڈورے پر گئے، روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیش میں کیا کمی، کنجوس لوگ پیسے پیسے کے لیے مرنے والے..... شادی بیاہ تیج تیوہار پر سب کونوں کھدروں میں پڑی پونجی اٹھا لاتے ہیں اور بیچ چوراہے کے رکھ دیتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں۔ دیکھو، دیکھو اور جلو۔ میں کبرت داس ہوں جس کی دھن باد میں کوئلے کی تین کانیں ہیں، کلکتہ میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں۔

تو سانولے داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا، میرے سسر نے موتیوں پرسوتے کا پتر جڑوا دیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوا دیئے۔

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی لیکن ساتھ چلی گئی۔ یوں ہی.... ایک آشا کے ساتھ اور کچھ نہیں تو چہل پہل ہی دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے، پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں سوا دو چار دھکوں کے کچھ نہ ملا... اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے۔ روپو نہیں آئی تھی، سب خوشامد کرتے رہے

پر روپو نے ایک ہی نہ پکڑ لی تھی، سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے، اس لیے ساری پرواہ کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پرواہ نہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کر میں نے بار بار سوچا، یہ ہی آجائیں، لیکن انہیں کیا پڑی تھی، انہیں تو دیش بھر کی انڈی چاہیے تھی، دنیا بھر کی دولت چاہیے تھی پیسے اور پیسے کے علاوہ انہوں نے کچھ سوچا، نہ ان کے باپ دادا نے ہماری کتنی اچھی ہوتی ہے بالو کی ماں ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جاتیں ہیں تو کہتی ہوں، اس بات میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ وچار ہوتا ہے کہ باہر جائیں اپنے آپ کو دکھائیں اور جب کوئی دیکھے تو اپنے ہی آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں، بھگوان نے سب دیا ہے، تم کیا سمجھتے ہو؛ تم بیٹھے ٹھنڈی سانسیں لو، آہیں بھرو ... جلو، مرو۔

ہاں، ہم اتنا ہار سنگھار، گہنے کپڑے کیوں پہنتی ہیں؛ اسی لئے تاکہ کوئی دیکھے، کوئی ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس انکار میں کتنا اقرار چھپا ہے۔ من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے، جو آتے جاتے من چلے کی ہمت کو للکارتی ہے۔

گھر آتے ہی میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے میں نے سب کپڑے اتار دیئے اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی، کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے پھر بتی بجھا کر ایسے ہی بستر پر لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹایا، میں چونک پڑی "کون"؟۔ میں نے پوچھا۔

دھیرے سے آواز آئی "میں، روپو"۔

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ روپو اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "میری لاج رکھ لو بھابی، میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔

میری سمجھ میں جب کوئی بات نہ آئی۔ لیکن ہم عورتیں۔۔۔۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا "نہیں میں کسی سے نہ کہوں گی۔۔۔" اور پھر یوں ہی۔۔۔۔ کیا ہوا؟

روپو بولی "تم ٹھیک کہتی ہو بھابی۔ وہ مجھے جانتے ہے۔

"وہ کون؟ میں نے پوچھا۔

"اب بتو ہت" روپو بولی "وہی منکی بھوڑ"۔

"تیرا ستیاناس" میں نے دل میں کہا۔

روپو بولی "جب بھی میں لادھا بازار سے گذرتی، وہ نکڑ پر مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا۔ لیکن میں پاس سے گذر جاتی، بُرے بُرے منہ بناتی، گالیاں دیتی۔۔۔ لیکن آج پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، میں بھیڑ میں چلی گئی، صرف اس کے ایک انگلی اٹھانے پر۔۔۔۔ اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شیو مندر میں چلے گئے جہاں یاتریوں کے لیے کوٹھریاں بنی ہیں میں کانپتی جا رہی تھی، آخر میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہوؤں لیکن مجھ سے کچھ کرتے نہ بنا۔۔۔ اس کے بعد ہم اندھے ہو گئے۔

میں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں، میرا سارا شریر کانپنے لگا۔ پہلے مجھے غصہ

آیا گھن پیدا ہوئی، پھر سب کچھ جاتے اپنے آپ ڈھل گیا ہیں جی ہی جی میں اپنی مور کھتا پر ہنسی مجھے تبھی کیوں نہ پتہ چلا جب میں نے روپو سے یہ سب کہا تھا ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے جب روپو بیاہی ۔۔۔ اور آج ۔۔۔۔" اچھا، اچھا تو چنتا نہ کر۔ میں نے روپو سے کہا" تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی بیٹی نے نہیں کیا۔ لیکن اب تو اپنے آپ کو سنبھالو۔ مہینہ بھر اپنا حال تاتی رہنا ہوئی! کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی ہو یرے میں تجھے میٹھے ابال کر دے دوں گی اب تو سو، رہ نہیں، میرے پاس، کہاں جائے گی، اس اندھیرے میں سب سوچیں گے، یہ کیا ہو رہا ہے، کون چل رہا ہے۔ اس آدھی رات کے وقت۔

۔۔۔ اور سن! میں تیرے بیاہ کی بات چیت چلاؤں گی، تو اوں، آں نہ کیجو، کرنا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لیے، اتنا ہی جتنا ہم سبھی کرتی ہیں مٹکی پھوڑ کوئی یوں ہی سلے ہے، راتج مجور، اس کی تو سوچ بھی مت۔۔۔ ہاں ۔۔۔ جو بات نہیں اچھی نہیں اچھی ہے، اور جو اچھی، سو اچھی ہے بھگوان نے تو مرد عورت بنا دیئے اور جب سے دنیا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگتے رہیں گے۔ جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں! لیکن وہ بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں اس گلی بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو۔ ایسا ہو تو یہ دنیا، یہ سنسار یہ دھرتی، یہ آکاش سب نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن ہی کتنے ہوتے ہیں، تین سو پینسٹھ ان میں سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج چاند

کو پکڑ لیتا ہے، اور بس۔

۔۔۔ اس لیے منش نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے، بیاہ کا راستہ۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں، بیاہ ہوتا ہے تب ماں، باپ، بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔۔۔ پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، جج دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

اور میں نے رو پو کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی میرے پاس پڑے پڑے وہیں سو گئی۔۔۔ نیند تو نہ آئی تو مجھے۔ یونہی جمائیاں لیتی ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کروٹ بدلتی رہی کبھی کبھی میرا ہاتھ رو پو کے شریر پر پڑ جاتا لیکن وہ بے ہوش پڑی تھی، سب کچھ کہہ سُن کر ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی، اور میں۔۔۔!

منکی بچھوڑ۔۔۔ رو پو کے بھیّا۔۔۔ رو پو۔۔۔ آئینے میں اپنا شریر سبھی کچھ سامنے گھومتا رہا پھر میں سوچنے لگی، یہ جو رو پو سے کہتی رہی ہوں، سچ بھی ہے، اور جھوٹ بھی، سچ اس لیے کہ کوئی اصول تو ہونا ہی چاہیے، یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے ملتے پھریں۔۔۔ تو اولاد کو کون سنبھالے، پریوار کیسے بنیں۔۔۔؛ اور جھوٹ اس لیے کہ بیاہ کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے، پھر دھیرے دھیرے عورت مرد ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر کچھ جاننے کی بات ہی نہیں رہتی۔ جیسے کوئی آدمی ہر سال آبو جایا کرے یا سور تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے۔ پھر مسوری کی پہاڑیوں پر چڑھنے کا مزا ہے، نہیں آتا سو جاتی ہے اور مولے مولے شریر بھی مردہ ہو جاتا ہے، تبھی تو

کبھی ۔۔۔۔

دوسرے کا ہاتھ لگے، تو سٹریا اور آتما دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں، شادی شدہ جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے اگر عورت میکے ہی جاتی رہے یا مرد دورے پر چڑھا رہے، کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتا ہو۔۔۔۔ تب بھی تبدیلی پرکرتی کا اصول ہے ۔۔۔۔ سدا گرمی نہیں رہتی نہ سردی رہتی ہے ۔۔۔۔ شکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن پکش کی رات کا اپنا۔۔۔۔ سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی، پھر رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، مور ہیں۔۔۔۔ ان جانے ان گنت۔

شادی بہت اچھی چیز ہے لیکن کیا ایسا سمے نہیں آئے گا اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے! یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہیں۔ اس چھت کے نیچے تم دونوں رہو گے، یہاں جو سنتان پیدا ہو گی، آدمی کی ہی ہو گی مرد باہر کام پر جایا کرے گا، عورت گھر سنبھالے گی اور بس۔۔۔۔ ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ لیکن بالو کی ماں میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے میں بیوی ہونے کی جگہ ان کی پریتما ہوتی تو کتنا خوش رہتی۔

ساری رات میں نے جاگ کر کاٹی، ساری رات میں سولی پر ٹنگی رہی، جب بھور ہوئی تو یہ چلے آئے، میں لپک کر دروازے کی طرف گئی لیکن انہیں مجھ سے بات تھوڑے کرنی تھی، میری طرف تو دیکھا بھی نہیں، آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھئی، تو بھی کوئی ہے، باہر جانے والے کا کیا ہے، ہزار روپ دیکھ کر آتا ہے، ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منہ تاکا کرتی ہیں اور پڑے

پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں، ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرم ارنڈی کا سوداگر! ہونہہ..... پگڑی تو دیکھو، کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑی ہے۔ جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پر انجن کے کوئلے سا پرا دہ پڑا ہے..... یہ دوت معلوم ہوتا ہے..... کمرے میں اور کسی کو جانے کی ہمت نہیں تھی، سوا دوا کے..... دوا گئیں، تو ان سے بولے "دوا جی! اسے کچھ کچی لسی کا گلاس بنا دے۔"

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی لسی بنانے، وہی صدیوں کی عادت، پل بھر میں تھوڑے چلی جاتی ہے۔ میں نے جی میں کہا، بڑا آیا ہے حکم چلانے، جیسے میں کوئی لونڈی باندی ہوں ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی غلام لیکن میں نے جلدی سے کچی لسی بنا ڈالی، روپو ابھی جاگی تھی، ایک کر بو باہر نکلی تو گلاس سے ٹکرائی، لسی سے میرے کپڑے تر ہو گئے..... پھر جو بچی کتنی بھیج دی۔

میں تم سے سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں! رات تک باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے آپس ہی میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا، یا گھر سوتے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی کی قسمت بنا سکتی ہے اور بگاڑ سکتی ہے۔ ہمارے دیش کی ارنڈی، توریا اور مونگ پھلی! ان میں وہ طاقت ہے۔ جو کسی دوسرے دیش کی دودھ ملائی میں نہیں۔ کسان ہل جوتتے ہیں..... بیج بوتے ہیں، کارخانے میں مزدور کام کرتے ہیں لیکن ان کی قسمت کا فیصلہ ان کرد ں میں

بیٹھے بیٹھے وہ لوگ کر ڈالتے ہیں جو ہل چلانے میں نہیں، بولنے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی، باہر آئیں تو آج ان سے دو باتیں کروں اور کہوں پیسے کے پجاریو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی، جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے اور آگے چل دیتی ہے۔ دیکھو تو تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مہریں، سونے، چاندی، ہیرے جواہر کی کان میں تم نے ہم سب کو بندی بنا رکھا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں، ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں۔

وہ نکلے۔۔۔۔ باپ اور دونوں بیٹے۔۔۔۔۔ نہ چہرے پر خوشی، نہ دکھ اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ سوچنے لگیں، آج ادھر میں کچھ کالا کالا ہے! دوّا آئیں اور بولیں "ان منڈی میں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھلے گی تو داخل کر دیں گے۔"

دیوالہ۔۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو بابو کی ماں؛ تمہارے لیے دیوالہ مر جانے کی بات ہے، ان سیٹھوں کے لیے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوالے نکالیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ اوپر نیچے کر جاتے ہیں جس سے لاکھ دو لاکھ کا منافع ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا۔

رات بھر یہ مرد لوگ نہ آئے! دن بھر کچہری میں رہے، شام کو میں اسی نجار چے میں بیٹھی تھی، سامنے اپنے سسر کو دیکھا، کمر کی طنابیں ڈھیلی کرتے

ہوئے میرے جیٹھ کی موٹے شیشے والی عینک ناک کی پورنچ پر آ گئی تھی، اور منہ پر تھوڑی اور کالک پت گئی تھی،

دو سال تک انہوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بیچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا، اشارے میں سب کہہ دیا لیکن انہوں نے میری نہ مانی، کوئی دھنی گھر دیکھنے میں وقت بے کار گیا،

روپو نے اتنے عرصے میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی مٹکی پھوڑ نظر آتا تھا، کب تک گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی، آخر میں ان تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپو کو خوب پیٹا، چھڑاتے میں مجھے بھی پڑ گئیں پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا،

روپو کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو لیتی، باہر آتی تو رو لیتی۔ میں نے ساس کی خوشامدیں کیں، وؤں کے سامنے ماتھا رگڑا اور کہا، کیا یہ ضروری ہے، اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو، باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو لیکن وہ کسی ایسے کی کھوج میں تھے، جو ان کی جات، برادری کا ہو جس سے بیوپاری کا ناطہ بھی بڑھے، لیکن ایسا کوئی نہ تھا، تھا بھی تو بڑی ناک والا، بہت پیسے مانگتا تھا۔۔۔۔ لاکھ دو لاکھ کی بات بھی نہیں، پانچ لاکھ،

روپا کھل کھیلنے لگی، اس نے صاف کہہ دیا، بیاہ کروں گی تو اسی مٹکی پھوڑ سے

مٹکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا، اور وہ آتش بازی کی دکان کا مالک تھا، آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے ادھر ادھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لئے کافی ہو۔ خود تو شیتل داس تھا، پر کام ہوائی پٹاخے کا، اپنا من شیتل ہو یا

نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کر دیتا تھا۔۔۔ دیول نگر میں دو چار ہی بانجے تھے جن میں سے ایک، وہ بھی تھا۔۔۔ ہر کھیل تماشے میں آگے۔ راس لیلا کا بندوبست اسی کے سپرد۔۔۔ وہ مہابھارت کا کنس تھا، اور رامائن کا راون!

لیکن روپو اب اس سے نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی، اور نہ رام لیلا دسہرے میں حصہ لینے کی چھٹی۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ میرے من میں جانے کیا کہ اتنی کی لہر اٹھی، شیو مندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور چلی گئی، شیتل کی دکان رادھا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پر تھی جہاں مہابیرجی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھرا رہتا ہے۔ اور ہر آتے جاتے کو تکتا ہے، کام دھام پر آنے جانے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، زنجیروں کے ساتھ لٹکی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے ہیں اور چل دیتے ہیں، جاکر شیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان پر کام کرتے تھے، وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا تھا، اور لڑکوں کو گالیاں دیتا تھا۔

دسہرے کے آس پاس کے دن تھے، اور شیتل داس سامنے ٹوکرے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھا، میگھ ناد بن چکا تھا۔ اب راون بنتے جا رہا تھا،

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا "کیا چاہیے، پھلجھڑیاں"؟

میں نے کہا۔ "پھلجھڑی لینے نہیں آئی، پھلجھڑی دینے آئی ہوں"۔

وہ کچھ نہ سمجھا دکان سے نیچے اتر آیا۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کو دیکھنے لگی جس نے ٹیلے کا تین چوتھائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ دس

سر لگنے والے تھے اور اوپر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلا گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شتیل کے سر کی طرف دیکھا جس پر ہر سال مٹکیاں پھوٹنے سے چھوٹے چھوٹے گھاؤ کے نشان پڑ گئے تھے، پھر مجھے جو کہنا تھا، چپکے سے کہہ دیا۔ شتیل داس کا چہرہ چمک اٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلہا اُدل سنایا کرتے تھے اور جسے سن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو کھنجری بجاتا تھا اور وہ شتیل تھا۔ چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے، اس لئے روپو انہیں دیکھ سکتی تھی۔۔۔ شتیل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا، میں مسکرا دی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شتیل کو نہ پہچان سکا، نہ پڑوسنیں اسے جان پائیں۔۔۔ کمبخت ایسا بہروپیہ تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی تے، جو اس کے ایک ایک پل کو جانتی تھی۔ روپو اندر بھاگنے لگی میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالو کی ماں! مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں لگی اور نہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ الٹا ایسا جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑا پُن کا کام کر رہی ہوں۔ ہمارے شاستری اِس طرف تھے۔۔۔ اور دَدا، ساس، جیٹھانی، سسر، جیٹھ، یہ، وہ، سب دوسری طرف۔۔۔۔ میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا کہ ان کے شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی، اس کے لبد میں نے دیکھا کہ عورتوں میں سے روپو گم ہے اور مردوں میں سے شتیل، باقی بھاٹ تلسی جی میں سے کچھ پڑھتے رہے۔

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اُٹھ کر گئی تو دیکھا، روپو اپنے

کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تاک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا، وہ کہاں گیا تو روپو نے بتایا، پیچھے سیڑھیوں کے راستے میں غائب ہوگیا۔ میں سمجھی بس مل لیے دونوں، اور کوئی بات نہیں ہوئی مجھے کیا پتہ بات کہاں جا پہنچی۔

گھر کے مرد لوگ بڑھی پر سے چلے آئے۔ میں سچ کہتی ہوں، اس دن مجھے روپو کے بھیا برے نہ لگے، انہیں خود بہت تعجب ہوا کہ یہ آج اتنا پھیلا کیوں رہی ہے، میں بہت خوش تھی، جیسے مجھے کچھ مل گیا ہے، مل بھی جاتا تو بابو کی ماں اپنے آدمی کے لیے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا؛ بالکل نہیں، الٹے بڑھتا ہی، میں سوچتی، میں کیا کرائی ہوں، ان بیچاروں کو کیا معلوم؛ جو لوگ عورت کو جنتی نہیں سمجھتے، بیوپار جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں جن کے دماغ میں بیاہ کا وہی پرانا وچار گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا، انہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ گھر بھر میں شور ہو رہا تھا۔۔۔ روپو شیتل کے ساتھ بھاگ رہی تھی کہ پکڑی گئی، میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ روپو سے الٹے سیدھے سوال کیے جا رہے تھے، لیکن اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی، وہ ڈھیٹ بن گئی تھی۔ اس کے تیور کچھ ایسے تھے کہ کر لو جو میرا کرنا ہے میں تو وہی کروں گی جو میرے دل میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا، اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلا۔

اب سب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نائی نے بالا گھاٹ میں ایک رشتے کا پتہ دیا۔ ایسے سیٹھ کا پتہ دیا،

جس کے چھ دیوالے نکل چکے تھے، اور جو نبولوں کا بیوپار کرتا تھا۔۔۔ سب کچھ جلد ہی طے ہو گیا۔۔۔ روپو کو منانے کا کام مجھے سونپا گیا۔ روپو کچھ مانی کچھ نہ مانی اور کچھ دنوں میں برات دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ شیتل سے کچھ نہیں تو دس گنا سندر تھا، یہ لمبا چوڑا تندرست، میں روپو کے پاس بھاگ گئی اور اسے سب بتا دیا۔۔۔ روپو۔۔۔ مسکرا دی، ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ میں تو ناچ اٹھی جیسے روپو کی نہیں، میری شادی ہونے جا رہی ہے۔

تم نے وہ شادی تو دیکھی ہے۔ بالو کی ماں، جو دیول نگر میں یادگار رہے گی ان کے بپا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں، ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس کس نے نہیں کھایا؟ کون نیگ لے کر نہیں گیا؟ ہمیں چھپر پھٹنے کو پوری بارات ملی، اور پھر وہ۔۔۔ دولہن کا دولہا! وہ چہل پہل ہوئی، وہ شور مچا کہ بس۔۔۔ بینڈ باجے گانے روشنیاں۔ میری جیٹھانی کے بچے خوش تھے، میں نے بلرام کو بلایا اور کہا، دیکھ نٹھے! تیری بوا کی شادی ہو رہی ہے، اس بے چارے کو کیا پتہ، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اور کیا ہونے جا رہا ہے وہ تو خوش تھا، ہاتھ میں ایک بڑا سا لڈو تھامے، اس نے صرف اتنا کہا، میں بھی سادی کروں گا چاچی۔"

میں نے کہا کس سے؟

بولا "بوا سے"

"ہشت" دادا جو پاس کھڑی تھی۔ بولی۔

ڈولی گئی... وہ آتشبازی پھوٹی کے رام رام! پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان سے کہہ سکے نشتبیل کو دلوایا تھا اور وہ خود اپنے سامنے چکر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے... پھر ڈولی گئی۔

کہیں مہینے دو مہینے کے بعد روپو آئی، اس کے چہرے پہ رنگ ہی اور تھا لڑکے نے اُسے اور اُس نے لڑکے کو خوب پسند کیا تھا۔ روپو کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

اب میں اس کے سامنے یہاں کے منگی پھوڑ کا نام بھی لیتی تو روپو خود ہی منہ پر انگلی رکھ لیتی۔ میں نے اس سے کہا۔ "روپو، دیکھا... میں نہ کہتی تھی"!

روپو بولی" اور تو کوئی بات نہیں بھابی، یہ مجھے پیار کرتے ہیں، پر دیو بہت ہیں۔ گھر میں کمانے والے... میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھائی اس لیے ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے انہیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔

" اور وہ تمہارا..." میں نے شرارت سے پوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں چاہتے۔ بس... روپو نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی، پھر بولی "بہت وہ کرو گی بھابی تو ماروں گی۔ ہاں"

میں مارے خوشی کے رو دی، لیکن کیا پتہ تھا ہمیشہ کے لیے رونا پڑ جائے گا۔۔ ہائے یہ مرد!... روپو چار مہینے سے یہاں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا، وہ روپیہ مانگتے ہیں اور یہ دینے کو تیار نہیں، روپو نے ٹھیک ہی کہا تھا لڑکا ڈبو ہے... بات یہ ہے کہ اچھے روپ جوانی

سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک آدمی آزاد نہ ہو سب بیکار ہے۔

ابھی کچھ مہینوں میں روپو آدھی رہ گئی ہے، وہ بخار چڑھے سے جی نیچے نہیں بھاگتی حالانکہ ہر دوسرے تیسرے روز اس دیول نگری کا بانکا سجیلا آتش باز، بہار کے گاتے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے، بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اس نائی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا تھا، وہ کہہ رہے تھے، ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے چاہے وہ ساری عمر یوں ہی بیٹھی رہے، ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، روپو کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا ہے۔"

⁂ ⁂ ⁂

ٹرمینس سے پرے

پنجاب میل چلی تو خاصی سست رفتاری سے پلیٹ فارم کے احاطے سے باہر نکلی ... دیر تک موہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سومترا کا بدن ایک سادہ سی ہینڈلوم کی ساری میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سومترا کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑی تھی جب کہ موہن ایک اسٹال کے برابر کھڑا آخری دم تک اپنا رومال ہلاتا رہا۔

گاڑی چلنے سے پہلے سومترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ الفاظ ہمیشہ کی طرح بیکار ہو گئے تھے۔ "پیچھے گھر کا خیال رکھنا"، "ہوسٹل کی روٹی مت کھانا" "ہفتہ میں ایک ... نہیں دو بار خط ضرور لکھنا" یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گونگی ہو گئی تھیں، اور انہوں نے موہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا۔ پھر بیوی الگ ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تائید سی مانگتی گئی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھوٹ بھی بول دے، لیکن کچھ لوگ ... موہن نے کچھ نہ کہا ... وہ پہلے تیز تیز اور پھر آہستہ آہستہ رومال ہلاتا رہا۔ یہ حرکت ایک رسم بن چکی ہے لیکن اچھی معلوم ہوئی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لیے دھڑک رہا ہے؟ یہ تو دکھائی نہیں دیتا البتہ رومال نظروں کے دھندلکے میں حل ہونے تک برابر اس آدمی کو دکھائی دیتا رہتا ہے، جو ... رہ جا رہا ہو۔

یہ سفر کی بجائے اس میں تو جب بھی کہیں جانے لگتا ہوں میری طبیعت گر سی جاتی ہے، اسٹیشن پہ ہجوم، محض، ہجوم کی وجہ سے آدمی تنہا رہ جاتا ہے، پھر آگے جانے کے لیے گاڑی تھوڑا پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز "ارے ارے، گاڑی چھوٹ گئی، میرا سامان رہ گیا" آخر... کوئی کسی کا نہیں... یہ دنیا... جب ایک بار تو جی چاہتا ہے آدمی ٹکٹ وکٹ لوٹا دے اور گھر جا کر مزے سے بیٹھ جائے چاہے پھر بیوی سے لڑے ہی۔

زندگی کی نتیجہ مندی یہی ہے کہ اداسی کے سائے میں بھی کہیں خوشی کے جذبے رینگتے رہیں اور گاڑی کے چھوٹتے ہی لپک کر سامنے آجائیں اور ان کی روشنی میں اداسیاں غائب ہو جائیں، کبھی جس کے ساتھ پروگرام بنتے تھے اب اس کے بغیر بننے لگیں۔ موہن نے ایک گہرا سانس لیا "چلو دو مہینے کے لیے چھٹی، کچھ چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے، سومترا لوٹے گی تو ایک بار اسے بھی پتہ چل چکا ہو گا میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں؛ پھر سے غارت کرنے کے لیے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہو گی، پھر کیسے پلٹے گی۔ الٹا مجھ سے کہے گی... تو کہاں چلی گئی تھی موہنی"!

موہن وکٹوریہ ٹرمنس کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لیے مڑا تو الٹی طرف سے کوئی گاڑی پلیٹ فارم پہ آ رہی تھی، موہن چونک گیا... اسے یوں لگا جیسے سومترا اس گاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے، جبھی اس نے ایک موٹی عورت کو کمپارٹمنٹ کے دروازے میں پھنسے ہوئے دیکھا، مسکرایا اور چل پڑا۔ اسے ریڈیو کلب جانا تھا تاش کے کچھ مداریوں کے ساتھ فلاش

کھیلنے کے لیے جہاں بیچ بیچ میں کبھی کبھی پان کی بیگم زندہ ہو جایا کرتی تھی اور سمندر سے آنے والے جھکڑ میں اس کی عنابی ساری کا پلو کسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا، پلو کے ہٹائے جانے تک ساری میں لپٹے ہوئے ایک وجود کے بجائے درد کا احساس ہونے لگتا۔۔۔

موہن جا رہا ہے۔ ان جانے میں گھر اور کار کی چابیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس سے وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ٹٹول رہا تھا تبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

"اچی" وہ رکتے ہوئے بولا۔

موہن اچلا کو جانتا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ اچلا کے شوہر رام گدکری کو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملا ہو گا۔ لیکن اچلا سے اکثر شاندار ہسیں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں وہ اپنی ایک اوباش سی سہیلی۔۔۔ ریبی۔۔۔ کے ساتھ وہیں ٹرین کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ نمستے نمستے، کے علاوہ موہن جام اور اچلا گدکری کے بیچ آٹھ دس نہیں تو بارہ پندرہ فقرے ہوئے ہوں گے جن سے پتا چلا تو صرف اتنا کہ وہ بھی کولابا میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن کف پریڈ کے ایک اچھے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور اچلا کاندوے پیر کی ایک پرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے اچی کے نام سے نہ پکارتا تھا لیکن ریبی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اس نام سے کرایا تھا۔ ریبی کو موہن اچھی طرح سے جانتا تھا۔ ریبی سمجھتی بھی تھی۔ پانی مصری کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس پر بھی وہ چھوٹتے ہی

کسی بھی پرائے مرد سے گھل مل جاتی تھی، اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی ٹھلیا میں رات بھر پڑا رہتا ہے، صبح تک پانی اپنی ہی تبخیر سے اڑ جاتا ہے اور پھر سے مصری کی ڈلیا ٹھلیا کی تہہ میں دکھائی دینے لگتی ہیں پہلے سے بھی صاف شفاف، چمکیلی، نوکیلی،،،

موہن کے پکارنے پر اچلا نے تھوڑا گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا۔"مو۔ اور کچھ دیر بعد بولی۔۔۔"ہن۔"

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پلو سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھ ڈالی، اب وہ مسکرا رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایکا ایکی کسی نے کوئی سنہرا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑا موہن کے قریب آتے ہوئے بولی۔۔۔۔"آپ؟ یہاں کیسے"؟۔

"بیوی کو چھوڑنے آیا تھا۔ موہن نے جواب دیا۔ کشمیر جا رہی ہیں، بچے کی چھٹیاں ہوگئیں نا۔۔۔آپ"؟

"میں"؟ اور اچلا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر اسی دم چپ بھی ہوگئی، کچھ شرماتے ہوئے بولی۔ میں ان کو چھوڑنے آئی تھی"،

"اور" اور موہن بھی ہنس دیا ایک نظر اچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسری گاڑی کے انجن کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر اچلا کی طرف دیکھ کر بولا۔"کہاں گئے گدگری صاحب"؟

"دلی"۔

"کب آئیں گے"؟

"یہی کوئی ہفتہ دس دن میں"۔۔۔ اچلا نے کہا۔۔۔ "کوئی کانفرنس ہو رہی ہے،

"شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں"!

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔"

اور اچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے، صرف ان میں ایک پن ڈھیلا ہو کر قدرے اوپر اٹھ آیا تھا، جسے اچلا نے اپنے مومی ہاتھوں سے دبا دیا، تبھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اوپر اٹھے رہے ہیں، موہن کی نظر اس کے پورے بدن کا طواف کرتے ہوئے ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اس حصہ میں جا رکی تھی، جو چولی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے ایکا ایکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے اپنے بدن کے ننگے حصوں کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا بدن کے اس حصے کو انگریزی میں مڈرف کہتے ہیں اور شہد کی مکھی کی طرح اسٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں بھنبھناتا رہا، مڈرف، مڈرف۔۔۔ مڈرف۔۔۔ مڈرف۔۔

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سب بیکار تھا، موہن جانتا تھا مکھی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے، بار بار اُڑ کر پھر آ بیٹھتی ہے جہاں سے اڑائی تھی بھلا اسے ہٹانے کی کوشش کریں تو ناک لوٹ جاتی ہے، مکھی اُڑ جاتی ہے۔

باہر گرمی بہت چکنی چکنی، گیلی گیلی تھی، بلاؤز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سونے کی طرح، خوبصورت، لگ رہے تھے، جو کانوں کو پھاڑے ڈالتا

ہے۔ پسینے کے قطرے ساریوں اور پتلونوں کے اندر ہی اندر پنڈلیوں پر ٹپکتے اور جونک کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اسٹیشن کا چلتا پھرتا پیاؤ پیچھے رہ گیا تھا اور یہ اسی کی وجہ سے تھا جو پیاس اور بھی تیکھی ہو رہی تھی، باہر ہال کے اندر ایک کونے میں تھوڑی جگہ ٹھنڈی تھی جہاں اوپر چھت پہ دو پروں والا پنکھا سست سی رفتار سے چل رہا تھا، اس کے نیچے ایک بڈھا منہ کھولے ہوئے سو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لیے شہر کے مردہ خانے میں پڑی ہے۔

موہن اور اچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے ذہن میں کوئی موضوع ڈھونڈ رہے تھے، جو زیادہ سوچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ اچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچھے جبھی اچلا میں اپنے بدن کے ان خطوں کا شعور عود کر آیا جنہیں عورت بدصورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت انہیں مفت دکھانا نہیں چاہتی، وہ یا پیسے مانگتی ہے اور یا محبت۔۔۔ محبت جو ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور جسے کپڑے پہنا دیئے جائیں تو وہ محبت نہیں رہتی اچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصے پہ ساری کھینچ لی۔۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظروں کی برچھیاں پیچھے سے اس کے بدن کے ہر پہلو پہ لگ رہی ہیں۔

"اچھا، موہن جی" وہ مڑتے ہوئے بولی "میں اب جاؤں گی"

"کیسے جائیں گی؟" موہن نے پوچھا۔

"ایسے" اور اچلا نے تھوڑا چل کے دکھایا اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس

دیے ۔۔۔ اتنی سی بات میں دونوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ آخر موہن نے کہا: میرا مطلب ہے آپ گاڑی نہیں لائیں۔

اچلا نے سر ہلاتے ہوئے کہا: "مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

"میں جو ہوں" موہن نے کہا۔ آج تھوڑی دیر کے لئے مجھے ہی اپنا ڈرائیور سمجھ لیجئے۔"

"جی ؟" اچلا بولی۔ "نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ میں بس پہ چلی جاؤں گی آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟" کا جملہ ہی ایسا ہے جس میں کوئی کسی کو تکلیف دینا چاہتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔ گویا اسے ٹٹولتا ہے۔ تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے ؟ یہ جملہ مرد کہے تو ایک عام سی بات ہے ۔۔۔ مگر عورت کہے تو ایک خاص بات ہو جاتی ہے۔ یہ عورتوں کے فقرے، جیسے جھوٹے کہیں کے "۔" مر گئی میں " وغیرہ ۔

اس میں تکلیف کی کیا بات ہے" ؟ موہن بولا " میں گھر ہی تو جا رہا ہوں راستے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔

گویا ریڈیو کلب موہن کے دماغ سے اپنے آپ براڈ کاسٹ ہو گئی تھی۔
تھوڑی حیص بیص کے بعد اچلا گرمی موہن جام کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی فریئر روڈ کی طرف سے نکلی۔ کراسنگ پر پولیس مین نے الٹا ہاتھ دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے موہن کو گاڑی روکنی پڑی۔ موہن پولیس مین کے الٹے ہاتھ پہ ہمیشہ جھلایا اور منہ میں گالیاں منمنایا کرتا تھا۔ لیکن اب کے وہی ہاتھ اسے

مسیح کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

دیپی کیسی ہے"! موہن نے آخر گفتگو کا موضوع ڈھونڈھ ہی لیا۔

اچلا نے جواب دیا۔" دیسی ہی ہے"

" کیا مطلب "! موہن نے چونکتے ہوئے کہا" میں تو سمجھتا ہوں دہ ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔"

" میں نے کب کہا بری ہے" اچلا بولی اور ہنسنے لگی۔

موہن اچلا کے جال میں آگیا تھا اور اب یوں ہی نچ نکلنے کے لئے اِدھر اُدھر اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے اس کے ہاتھ پہ چلے آئے۔ اچلا اس سے دور ہٹ کر دروازے سے لگی بیٹھی تھی جیسے کپڑا بھی چھو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے موہن بولا "آپ مجھ سے اتنی دور کیوں بیٹھی ہو ؟"

"یونہی" ۔ اچلا نے کہا اور مشکل سے ایک انچ بھر موہن کی طرف سرک آئی" میں نے سوچا آپ کو گیر بدلنے میں تکلیف نہ ہو"

" پھر وہی ... تکلیف"!

جب تک پولیس مین نے ہاتھ دے دیا تھا۔ لیکن موہن کی کار بدستور کھڑی تھی۔ پولیس مین کی سیٹیاں اور پچھلی کاروں کے ہارن ایک ساتھ سنائی دینے لگے۔ موہن نے جلدی سے گاڑی کو گیر میں ڈالا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ہٹا لیا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی بند ہوتے ہوتے رکی۔ پولیس مین سے کچھ آگے نکلی تو اچلا بولی "کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلاتے ہیں۔"

"نہیں" موہن نے کہا۔ "میں تو اتنے پیار سے چلاتا ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

مگر آج ۔۔۔۔"

"آج کیا ہوا"

"آپ ہوئی ہیں ۔۔۔۔ اور کیا ہوگا!"

موہن اور اچلا ٹاؤن ہال کے سامنے سے جا رہے تھے۔ نہ معلوم کیوں موہن کا جی چاہ رہا تھا، آج کوئی ایکسی ڈنٹ ہو جائے، ایک بس تیزی سے گزری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی خواہش کو دبانا پڑا۔ سامنے ہال کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے موہن نے کہا۔

"کتنا اچھا ہے"

"بہت اچھا ہے"

الفنسٹن سرکل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بپھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ شاید اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ کسی اندرونی تمازت سے تمتمایا ہوا تھا۔ اچلا نے موہن سے پوچھا۔ آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہے۔

"اچھی"

اور موہن نے "اچھی" کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اچلا میں کوئی فرق نہ رہا اچلا خوش ہو گئی۔ کوئی ایسا کر سکتا تھا؟ وہ خوش ہو گئی۔ یونہی دکھاوے کے لیے بولی۔ "میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں"۔

موہن نے ایک نظر اچلا کی طرف دیکھا اور سب کچھ کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔

کاما ہال، لوائین گیٹ گزر گئے اور موہن کی گاڑی ریگل سینما کے پاس سے نکل رہی تھی، سامنے کا بت کم ہو رہا تھا۔ ریگل میں تصویر اچھی تھی۔ پھر گرینڈ بازار میں ہو رہا تھا، بھیلیرے کی دکان اچھی تھی۔ گاڑی کانہ دے پر سہینہ سدن کے سامنے رک گئی جہاں اچلا رہتی ہے۔

اچلا نے چھلتی ہوئی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا سوائے سامنے کے ٹیلر ماسٹر کے، جو اچی کا ماں باپ جانتا تھا، کسی دوسرے نے اچلا کو موہن کی کار سے اترتے نہ دیکھا تھا۔ دیکھا بھی تو اسے کیا پروا تھی؟ موہن کو کیا حیا تھی۔ اس پر بھی ایک دم دروازہ کھول کر اچلا گاڑی سے اتر گئی، تھوڑا ٹھٹک کر کہا۔ اچھا موہن جی، بہت بہت شکریہ اور چل دی۔

موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا، ایک ٹانگ اندر تھی اور دوسری کھلے ہوئے دروازے سے باہر، وہ اتر کر اچلا کے لئے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع ہی نہ دیا۔ کچھ دور جا کر اچلا کو جیسے کچھ یاد آیا، وہ تھوڑا رکی اور جو کہا بھی تو صرف اس لئے کہ وہ اسے نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی فقرے کو روکے ہوئے تھی، لیکن بعض اوقات جسم روح سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

"کبھی آیئے گا، موہن جی۔"

اور موہن کے جواب کا انتظار کئے بغیر اچلا گھر کی طرف لپک گئی پیچھے جیسے

موہن ہوا سے باتیں کر رہا تھا، آؤں گا آؤں گا، کیوں نہیں؛

اچلا کا خیال تھا، موہن اتنا تو سمجھدار ہوگا ہی، اِن کے گھر پہ نہ ہونے پر، کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے، یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات ہے۔

موہن واقعی سمجھدار تھا، ورنہ وہ دوسرے ہی دن اچلا کے ہاں پہنچ جاتا جب کہ اپنے پتی رام لگر کری کا اچلا کے دماغ میں تصور بھی موجود نہ تھا۔

موہن جام نے گھنٹی کچھ اس زور سے بجائی کہ اچلا گھبرا کر بھاگی چلی آئی جیسے رام اگلے روز ہی کسی پشت لوان پر بیٹھ کر آ گئے، ابھی تو اسے کپڑے بھی ٹھیک کرنے کا موقع نہ ملا تھا، دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ باہر نکالا اور پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹ گئی، اپنے آپ میں سمٹ گئی اور بولی ذرا رک جائیے۔۔۔۔

اور وہ اندر بھاگ گئی۔

موہن میں اتنی تاب ہی کہاں تھی، وہ تو نیچے ہی سے یوں آیا تھا جیسے فٹ گیئر میں لگا ہو۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا، اگلے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم میں تھا، اس کے تو سر پہ بھی جیسے کوئی آنکھ تھی جس سے چھت تک دکھائی دے رہا تھا، جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اچلا کا بیڈ روم صاف دکھائی دیتا تھا۔

عورت اور گھر میں فرق ہی کیا ہے؛ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہیے، آخر اتنا بھی کیا! لیکن موہن پیر سے سر تک امڈا ہوا تھا جیسے اچلا بیڈ روم کے کھلے دروازے میں سے سمٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، دونوں بالکل ایسے

تھے جیسے جذبات اور خیالات، آنکھوں اور جسم کے اعتبار سے بھگوان نے انہیں بنایا تھا۔ اچلا پلنگ کی پائنتی پر سے ساری اٹھا کر جلدی جلدی میں اسے نیچے کے کپڑوں میں لپیٹ رہی تھی۔

"معاف کیجیے۔۔۔ موہن جام نے وہیں سے کہا،

اور وہیں سے ویسا ہی، اچلا نے جواب دیا "کوئی بات نہیں"۔

ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے بیچ ایک چھوٹی جگہ تھی جہاں شیشے کی ایک کیبنٹ کے اندر شوجی بھوبے ناتھ کی تصویر ٹنگی تھی اور اس پہ ایک باسی سا ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں، ساتھ کنواری مریم کی شبیہہ بھی تھی اور گورو نانک کی بھی، اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پہ لیڈا ننگی کھڑی تھی اور راج ہنس اسے اپنے پروں میں دبائے چونچ اٹھائے خوشہ چینی کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحہ میں موہن جام نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں! سومترا دیکھ لی تھی، اور دیبی دیکھ لی تھی، ژاں اگیبو رد یکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی، اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سگی بہن تھی، اور پایل میں اپنے ولونگ ماسٹر میاں کے ساتھ رہتی تھی،

موہن نے عورت کو ہمیشہ مایا کے روپ میں دیکھا تھا، وہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور معلوم ہوتی تھی، اچھا اور برا، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت کبھی بدصورت طریقے سے آپس میں گھلے ملے ہوئے تھے، پھر عورت کپڑوں میں بھری ہوئی دکھائی دیتی وہ دبلی نکلتی اور دبلی دکھائی دینے والی بھری

ہوئی ۔۔۔ اسے ہی تو مایا کہتے ہیں یا لیلا ۔ مثلاً: ایسی تندرست عورت جسے دیکھتے ہی گردے میں درد ہونے لگے ، اس سے ڈرنا بیکار کی بات ہے اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے الجھنے میں آنا بھی نفع نہیں ہوتا جتنا کسی مزدور کو بیس سیر لکڑی کاٹنے سے ہوتا ہے ۔

مایا جس کے بارے میں سوچیں کہ یہ رام ہوئی ، وہی اپنی حکمت ناکام ہوئی اور جس کے بارے میں کہیں یہ ہاتھ نہ آئے گی ۔ آخر وہی گردن دبائے گی ۔ اور مایا کیا ہوتی ہے ؟ البتہ ایک اور مایا ہوتی ہے جو پالینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی ۔ اس دنیا سے جاتے سمے یوں معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی کو نہ پایا ، آپ کو سب نے پالیا ۔

جب ہی ساری اور بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اچی ڈرائنگ روم میں چلی آئی ، وہ کتنی حسین لگ رہی تھی ، کیا صرف اس لئے کہ وہ دوسری عورت تھی ۔ نہیں نہیں وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی ۔ اس میں کوئی بات تھی ، جو کسی دوسری میں نہ تھی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں ، مگر اس کی بھوؤں پہ بچپن کی چوٹ کی وجہ سے ہلکی سی خراش تھی جس نے بالوں کی تحریروں کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا ، اور وہ خراش ہی تھی جنہیں چوم چوم لینے کو جی چاہتا تھا ۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اوپر اٹھا کر اچی نے سامنے سے اپنے بال قدرے اوپر اٹھا دیئے ۔ وہ بالوں کا ایک بھدا سا بن گیا تھا ۔ سونے اور ہیرے کے تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ وہ اپنی ہی ساری

کے پلو سے اپنے آپ کو ہوا دیتے ہوئے بولی "اُف! آج کتنی گرمی ہے"۔

اور پھر ہاتھ دائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پر پنکھے کے سوئچ کو دبا دیا۔ جب ہی موہن بولا "میں سوچ رہا تھا"۔

کیا سوچ رہے تھے آپ؟ اپلا نے ایک منتظر نگاہ سے موہن کی طرف دیکھا۔

"یہی" موہن نے کہا "کہ آج گرمی کتنی ہے۔ اُف!"

اور جب پنکھے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا تو موہن اور اپلا تسکین کا سانس لیتے ہوئے آمنے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا، وہ ایک دوسرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا یہ ٹھیک بھی تھا۔ اگر دنیا بھر کے مرد عورت فطری زندگی گذارنے لگیں تو کیا ہو، لیکن۔ مرد اور عورت دونوں نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل۔۔۔ جسموں کو ماریئے گولی روحوں کو پا لینے کے لیے بھی کیا ابلا سکا سے ہو کر آنا پڑے گا۔

ایسے ہی تکلف میں لوگ ایک دوسرے سے میلوں دور چلے جاتے ہیں، پھر عجیب طرح کی کشمکش شروع ہوتی ہے۔ جان نہ پہچان اور آتے ہی پکڑ لیا! اور یہ بھی پہلے کیوں نہ بلایا؟ کیا سمجھتے ہو، محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر پہلا ہی جملہ اور پہلی ہی حرکت ایدیہ چھا جاتے ہیں! ایک دن دیوی ایک پینٹر کے بارے میں جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے، کہہ رہی تھی "میں تو اپنا سب کچھ اس پہ لٹا دیتی، لیکن چھوٹتے ہی کیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا"۔

ایسے تھوڑی ہوتا ہے، میں نے اسی بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں اور وہ کسی ضد میں پڑ گیا ہے۔ جانے سمے کا وہ کون سا آنش تھا جس میں... سنا ہے وہ اگری پاڑے میں کسی رنڈی کے پاس جاتا ہے"۔

اچلا کے کوئی بچہ نہ تھا۔ پانچ چھ سال کی شادی کے باوجود اس کی ماتا ویسے ہی دبلی پڑی تھی۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی ایک نوکرانی تھی جو اچی کے اشارے پر چائے بنا کر لے آئی۔ پھر ایک پلیٹ میں ختائیاں بھی لائی جو اچلا نے گھر میں بنائی تھیں اور جن پہ پستہ فراوانی سے بکھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے موہن کو کبھی دیکھا تو نہیں، کے انداز میں دیکھا اور پھر رسوئی میں کام کرنے کے لیے چلی گئی۔

"لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے"۔ موہن نے ختائی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں"۔ اور اچلا نے اندر کی طرف دیکھا۔ "پر جوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا نہیں چاہیے۔

"کیوں رکھنا نہیں چاہیے"؟

"کیا بتاؤں"؟ اور اچلا ہنس دی۔ "روز کوئی نیا البیلا دروازے پر موجود ہوتا ہے۔"

اور پھر دونوں مل کر ہنسے۔ موہن نے بات شروع کی۔ "میں بھی تو ہوں"۔

اچی کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ نگاہیں چرائے، چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے وہ بولی۔ "آپ کی بات دوسری ہے۔ اور پھر ایکا ایکی "اب کے رام آئیں گے

تو میں انہیں آپ سے ملواؤنگی، بڑے مزے کے آدمی ہیں۔

موہن نے چھیڑا۔ اس کا مطلب ہے اس سے پہلے نہ آؤں؟"

"نہیں نہیں" اچلا نے گھبراتے ہوئے کہا، آپ جب جی چاہے آیئے"

"آپ کا اپنا گھر ہے"۔

پھر اچلا نے سوچا۔ وہ کیا کہہ گئی، عورت ہونا بھی ایک مصیبت ہے کیوں وہ ہر وقت ڈرتی رہتی ہے؟ کیوں کہتی کچھ ہے، مطلب کچھ اور ہوتا ہے؟

اور اچلا نے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں، جیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں نہیں۔ ایک رام ایودھیا میں پیدا ہوئے اور ایک اب بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں، اور کولابہ میں رہتے ہیں،

موہن جام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ وہ سومترا کی باتیں کرے دونوں میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے جانے بوجھے بغیر، وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے، موہن نے بتایا، سومترا بڑی گریٹ عورت ہے، لیکن اس کی صحت کی خرابی نے پوری زندگی پر غم کی ایک چھاپ لگا دی ہے"۔

جب ہی نوکرانی ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی "بائی میں جاؤں"؟

"نہیں نہیں" اچلا نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، کپڑے دھو جا کر دیکھتی نہیں غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو چلو۔۔۔"

اور نوکرانی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا

موہن بدستور سومترا کے بارے میں کہہ رہا تھا ''دس سال سے جس عورت نے تمہارا ساتھ دیا ہو اسے تم صرف اس لئے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے؟ جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال تمہاری خدمت میں لگا دیئے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمہ دار ہو میں تو سوچ بھی نہیں سکتی''

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے۔

اچلا کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس میں برسوں کی دبی ہوئی کوئی چیز ابل پڑی ''نہیں نہیں، موہن جی''۔ وہ بولی۔ ''ٹھیک ہو جائیں گی''۔ اور پھر موہن کے ایک دم پاس پہنچتے ہوئے اس نے ساڑی کے پلو سے موہن کی آنکھوں کو پونچھ دیا۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اٹھا اور پھر بولا ''اچھا جی۔ میں چلوں گا''۔

''بیٹھئے تو۔ کچھ دیر''۔ اچلا نے پھر ویسا ہی جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا ''مجھے ساڑھے گیارہ بجے اجائی پیپر ملز میں جانا ہے''۔

اور موہن فریادی نظروں سے اچلا کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اچلا اٹھی، وہ مسکرا رہی تھی بیڈ روم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف دیکھا، وہ کیسی لگ رہی تھی؟ اسے اپنا آپ اچھا لگا، پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی۔

''تمہارا وہ جوشی نہیں آیا؟'' اچلا نے کہا۔

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نوکرانی بولی ''وہ صاحب جو آئے تھے چلے گئے؟''

''ہاں''۔ اچلا کو کتنی تسلی تھی۔

تم جارسی کے ساتھ بچر چلی جانا"۔ اچی نے کہا" تمہارے سب لڑکوں سے ایک وہی مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے"

اور روزی ایکا ایکی خوش ہو اٹھی۔

اچی سے موہن کی غالباً یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی، اب وہ ٹیلر ماسٹر اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی موہن کی کار میں آ بیٹھی تھی اور دونوں شام کو ہوا خوری کے لیے نکل جاتے تھے۔

کر دیں، ایک چٹھی میں تو مذاق بھی کیا: اگر تم نہ آؤ گی تو میں کسی دوسری سے لو لگا لوں گا" اور اس نے سومترا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام پریج کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی بکیلے کے پاس اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اچلا نے کی منشن کر رہی ہو،

موہن نے اچلا کا ہاتھ تھام لیا۔ مزاحمت تو ایک طرف، اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا اور دونوں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا" گدکری کب آنے والے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ایک دن میں۔"

"کانفرنس لمبی ہو گئی"

بھگوان جانے ۔۔۔ اِن مردوں کا کیا پتا! کس سوتن کے سنگ راس رچا رہے ہوں۔"

"کیا بات کرتی ہو" موہن نے اچی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ تو بھگوان رام

ہیں تمہارے لیے :

"بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو ساتھ نہ لے جاتے ؟"

موہن نے ہنستے ہوئے کہا ۔ "اب کانفرنس میں تھوڑے جا سکتی ہو ۔"

اور موہن نے اچی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا ۔ اچی نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن پھر جیسے اپنے آپ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا ۔ اسے یوں بھی کسی آسائش کی ضرورت تھی ، کیونکہ جب سے گاڑی بیک بے میں آ کر اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی ، اس نے اندر ہی اندر کانپنا شروع کر دیا تھا ۔ اس کی نسوں کو کسی آرام کی ضرورت تھی ۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پہ رکھ دیا ۔

موہن اچلا سے پیار کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پاس چلا آیا اور بولا ۔ "ناریل پانی ۔"

"نہیں چاہیے" ۔ موہن نے اچلا سے تھوڑا الگ ہوتے ہوئے کہا ، لیکن ناریل والے کو بدستور وہیں کھڑا پا کر وہ ایک دم جھلا اٹھا ۔ "ابے کہا نا ، نہیں نہیں چاہیے اور پھر جاتا ہے یا ۔ ۔ ۔ اور موہن جیسے اسے مارنے کے لیے لپکا ۔

اچلا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا ۔ "کیا کر رہے ہو ۔" کچھ گھبراتے اور اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی ۔ "دیکھتے نہیں ہاتھ میں چھری ہے ۔"

"ہو گی ۔" موہن نے بے پروائی کے انداز میں کہا ۔

ناریل والے نے اپنی مالاباری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا ۔ کچھ دور پتھر کی دیوار پہ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے آواز دی ۔ "مجا کر بابو ۔ ۔ ۔ مجا کر ۔ ۔ ۔"

موہن تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اچلا سے کہنے لگا، "گھر چلتے ہیں۔
"کس کے گھر؟
"میرے... تمہارے روزی کیا وہیں ہو گی؟
نہیں... وہ پکچر دیکھنے گئی ہے اپنے بوہنی کے ساتھ۔"
تو پھر... ٹھیک ہے..."
"نہیں نہیں۔" وہ بولی "گھر پہ ہمیں کیا کرنا ہے"؟

دراصل اچلا کو گھر میں شیشے کا کیبنٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یاد آ گئیں تھیں۔ وہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بیچ کا دروازہ بند کیا کرتی تھی اس کے بعد پتھر پہ بیٹھے ہوئے بے فکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر جب موہن نے اچلا کا منہ چوما تو اس میں پہلی سی خود سپردگی نہ رہی تھی۔ "نہیں نہیں"۔ اس نے خفیف سا کہا جو احتجاج تھا اور نہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر اچی کے چھوٹے بڑے راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر الگ ہو گئی۔ موہن کو برا سا لگا۔ اس نے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر ایک بھرپور حملہ سا کیا لیکن اچلا کسی نہایت ہی مضبوط قلعے میں محبوس ہو کر بیٹھی تھی۔ وہ شکایت کے لہجے میں بولی "نہیں نہیں" اتنا ہی بہت ہے۔

"بے وقوف نہ بنو اچی" موہن نے برافروختہ ہو کر کہا "پیار کا یہی مطلب تھوڑی ہوتا ہے"؟
جو ہوتا ہے وہ سمجھا دو"
"کیوں؟ بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا؟

" ہوتا کیوں نہیں " موہن نے اپنی مردانہ صفت کو چھپاتے ہوئے کہا اور اسے اپنی بہن رادھا یاد آگئی جو پاربل میں رہتی تھی۔

" یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے" اچی بولی۔ ایک دو دن میں وہ آجائیں گے۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں سوتر ابہن بھی لوٹ آئیں گی۔

" ہوں "

" بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں۔

" ٹھیک ہے موہن نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، آج سے میں نے تمہیں بہن کہا" اور موہن نے زناٹے سے گاڑی چلادی۔

اچی بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایاں بازو پکڑ لیا اور شانے پہ اپنے بالوں کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی " تم تو روٹھ گئے۔

" روٹھوں گا کیوں" موہن نے کہا " بھلا بھائی بہن سے روٹھ سکتا ہے "

اچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کاندھے سے ہٹا لیا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی سیٹھ سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج دروازہ کھولنے کے لئے موہن نے ذرا بھی جہد نہ کی۔۔ اچلا بے دلی سے اتری۔ سامنے کا ٹیلر ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ لوگ بھی۔ لیکن اچلا کو جیسے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بے حد متفکر تھی۔ ایسے وسوسے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے ایک ڈر تھوڑے تھا۔ ہزاروں تھے جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننا

ممکن نہ تھا۔

"آپ آؤ گے"؟ اس نے پوچھا۔

"آؤں گا، آؤں گا۔ کیوں نہیں" موہن نے کہا اور پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا، جیسے کوئی بچے کو ڈرا تو سکتا ہے مگر ایک حد تک۔

اس کے بعد موہن "ٹاٹا" کہہ کر چلا گیا۔ اچلا جب گھر لوٹی تو کئی قسم کا بوجھ اس کے سر سے اتر چکا تھا۔

اگلے ہی روز گدگری چلے آئے۔

اچی انہیں اسٹیشن پہ لینے گئی تو دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کے شوہر نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا"؟ اچلا نے پوچھا۔

"ایسے ہی۔ اس کے پتی نے ہنستے اور ایک نہایت ہی عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "من کی موج"۔

اور پھر قلی کے سر پہ سوٹ کیس رکھواتے اچی کے پاس آتے ہوئے بولا، بری لگتی ہیں۔

"نہیں بری تو نہیں لگتیں مگر۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جا رہی ہوں"۔ اچلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدگری نے چھیڑا۔ اچھا ہے نا۔ ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھ لئے۔

اس نے سوچا، اچی ہنسے گی اور اس لطیفے سے پورا لطف اٹھائے گی یا دھپ سے پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہے گی "شرم نہیں آتی۔ لیکن اچلا نے کچھ بھی نہ کہا

اٹھا جیسے کسی فکر کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر سے گذر گئیں، ایک متجسس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پر دیکھا جو مونچھوں کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بیوقوف نظر آرہا تھا اچلا کو یقین آگیا کوئی ایسی دلیسی بات نہیں ہے۔ اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی، مگر رام گدکری کانفرنس کا قضیہ لے بیٹھے تھے،

گھر پہنچ کر اچی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا، وہ ایک بچی کی طرح مچل گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر بیڈ روم میں لے گئی اور اس کے گلے لگ کر زار زار رونے لگی،۔۔ رام گدکری حیران ہی تو رہ گیا۔

ارے گیارہ ہی دن تو گئے ہیں۔

لیکن اچی رو رہی تھی، اور مچل رہی تھی۔ اسے لپٹاتے، دلاسا دیتے ہوئے آخر میں رام نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا تم اتنا ہی ڈر جاؤ گی۔

"میں یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں؟" اچلا نے ایک دم پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں، پیار کے مارے" اور رام گدکری ہنس دیا۔ آگے بڑھ کر پھر سے اچی کو کلاوے میں لیتے ہوئے بولا "میں جانتا ہوں اچے، میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں" "بس"؟

"اس سے بھی زیادہ"

جھوٹے کہیں کے مجھ سے پیار کرتے تو یہ۔۔۔ مونچھیں رکھتے؟"

اچلا کا خیال تھا رام نے مونچھیں کسی لڑکی کی انگیخت پہ رکھی ہیں۔ رام سمجھ گیا اسے اچلا کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پہ خوشی تھی، پیار میں اس نے

منہ آگے بڑھایا تو اچلا نے اپنا منہ پیچھے کی طرف موڑ لیا جس پہ رام نے وعدہ کیا کہ اگلے ہی روز وہ مونچھیں ڈیچھیں سب منڈوا ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں جو بھی دکھائی دے گا اس کی بھی۔

دو ایک ہفتہ کے بعد وعدہ کے مطابق، موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچی کچھ جھجکی، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے پتی رام گدکری کی طرف لپکی اور بولی جی میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں، میں نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے"۔

"بھائی بنایا ہے"؟

"ہاں۔ اچلا کہتے گئی۔ کیا بھائی نہیں بنا تے"؟

اور اس طرح رام گدکری کو پکڑ کر اچلا موہن جام سے ملوانے کے لیے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے وہ ناسمجھی کے عالم میں ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدکری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اٹھایا بٹھایا نہیں یا اس کی مناسب خاطر مدارت نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی کچھ نہیں سمجھتا مگر کئے چلا جاتا ہے مسکراہٹیں بناوٹی تھیں، ہنسی بناوٹی۔ ہی ہی ہی۔۔۔

اور اچلا تھی کہ لٹی جا رہی تھی، ایک بار بھائی کہہ دینے کے بعد جیسے چھٹی ہو گئی تھی،

اس نے نہ صرف چائے ختائی وغیرہ سامنے رکھیں بلکہ روزی کو بھی بازار بھیج دیا، کچھ نمکین چیزیں لانے کے لئے۔ رام گدکری یہ سب برداشت کر رہا تھا لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ یہ تھی، کہ موہن جام کے آتے

پر اچلا اسے کیوں بھول چکی تھی، جو اس کا پتی تھا، اس کے بھائی کا جیجا! اور رام گدکری دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اچلا کتنی بے بس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لئے اچلا اندر جاتی تو یہ مرد لوگ ایک دوسرے سے سرسری طور پر تکلف محض تکلف ایک آدھ جملہ کہتے۔ رام گدکری کچھ کانفرنس کا رعب ڈالنے کی فکر میں تھے اور موہن جام اس مال کی شپ منٹ کا ذکر کر رہے تھے جو انہوں نے ابھی ابھی جاپان سے منگوایا تھا۔ دونوں فقرے بیچ بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچلا اندر سے آئی تو اس نے ساری بھی بدلی ہوئی تھی اور سامنے کے بالوں کا پھر سے کراؤن بنا لیا تھا، اور خوشی تو اس کے ساتھ ہی باہر لپکی آئی تھی۔

"بھابی نہیں آئیں بھائی صاحب"؟ اچلا نے پوچھا اور پھر رام گدکری کی طرف منہ کرتے ہوئے بولی، وہ کشمیر گئی ہیں۔ میں تو ملی نہیں۔ سنا ہے بڑی اچھی عورت ہے"۔

ضرور اچھی ہوگی۔ رام نے اتفاق کیا۔

"اور رام پھر ایک متعجب سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحے کے بعد موہن جام اٹھ کر چل دیا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔ کہہ کر اچلا دروازے تک اسے چھوڑنے گئی۔ اور پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ دروازے سے نکل کر لینڈنگ تک، اور پھر لینڈنگ سے بھی نیچے چلی گئی، حالانکہ اس کا شوہر مہمان کو رخصت کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لئے محض تکلفاً اٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کا رشتہ چھوٹا ہوتا ہے۔

نیچے، بازار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا کہ وہ اچی سے پیار کرے اچی کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی، وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا جیسے اس نے کچھ پیار سے دبا دیا اور بولا "اچی! کبھی تم میرے ہاں آؤ نا"

"آؤں گی" اچی نے کہا۔ ان کو بھی لاؤں گی"

اس کے بعد اچلا گاڑی تک چلی آئی موہن جام رخصت ہوئے تو اچلا اور موہن دونوں۔۔۔ کی آنکھوں میں آنسو تھے،

اچلا اتنی ہی تیزی سے اوپر آگئی۔

رام گدکری کو اچلا نے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی "دیکھئے میرے بھائی صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک۔۔۔"

رام سر ہلاتا گیا حالانکہ اس کے ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ یہ بیچ میں خواہ مخواہ کا بھائی آٹپکا، اس کی ضرورت کیا تھی، کچھ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ جبھی تو اس نے کہا "اگر سچ مچ تمہارا بھائی کا رشتہ ہے تو بھائی صاحب کیوں کہتی ہو بھیا جی کیوں نہیں کہتیں"؟

"تو یہ بھی کوئی بات ہے بھلا"؟

اور اچلا بدستور موہن کے گن گاتی گئی۔ کیسے وہ دیبی کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالی پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام وہاں نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا اور اچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتانے کے لئے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑے، جن کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ یہ رشتہ بھگوان نے نہیں انسان نے بنایا تھا۔

اس کے بعد ایک دوبار موہن جام آیا اور اچلا اسی طرح سے بے اعتبار اور بے خود لپکی جھپکی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام گدگری پر بڑے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ اپنی خاموشی انہیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔ سامنے طاق پر ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا جس کی سوئی گھماتے ہوئے رام نے اچی سے کہا۔

"جانتی ہو ٹرانسسٹر کسے کہتے ہیں"؟

"یہی جو سامنے پڑا ہے۔"

"نہیں"۔ رام نے کچھ خفگی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے جلے جذبات میں کہا "سسٹر بہن کو کہتے ہیں، اور ٹرانس سسٹر وہ بہن ہوتی ہے جو سگی نہ ہو، ایسے ہی بھاڑے لے کر نائی ہو، اسی لیے تم بہت شور مچاتی ہو۔"

اچلا کو بہت غصہ لگا "کیا مطلب؟ آپ بہن اور بھائی کے رشتے پہ شک کرتے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

"میرا مطلب ہے ---"

"میں سب جانتی ہوں" اچلا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم مرد لوگ سب کمینے ہو تمہاری نظروں میں کوٹ کوٹ کر غلاظت بھری ہے۔ کیا دنیا میں مرد عورت پتی پتنی بن کر ہی مل سکتے ہیں؟ کیا سنسار میں ---" اور اچی کا گلا بھر آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی کیبنٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جاکر دوزانو ہو گئی اور دہائی دینے لگی "میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان تو میرے شریر میں کیڑے پڑیں، کوڑھ چل جائے۔"

رام اب پچھتانے لگا تھا۔ اس نے پیچھے سے آکر اچلا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اٹھایا لیکن اچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار کے ساتھ جا لگا، سر پہ معمولی سی چوٹ بھی لگی۔ اچلا اتنی تندرست تھی کہ رام گدگری ایسے اکہرے بدن والے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جا کر اپنے آپ کو بستر پر گرا کر اونچے اونچے رونے لگی۔ رام اب بہت ہی پچھتا رہا تھا، اور آپ جانتے ہیں پچھتائے ہوئے مرد کی کیا شکل ہوتی ہے۔ رام کی ساری شام اچی کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلا منتوشری سبھا گھر میں ولایت حسین کے ستار سننے کے لئے جانے والا تھا، اور اچلا کے لیے بھی ٹکٹ خرید کر لایا تھا، جو اس نے اپنی حسین مگر غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ پھر وہ وہیں بستر پر پڑی گھر کی اس ستار کی کمر میں بازو ڈال کر اس سے تار درست کرنے لگا، چونکہ، نہ تھا اس لیے ایک بھی سر ٹھیک نہ نکلا۔ آخر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔ "میں تم پہ اتنا سا بھی شک کروں اچے، تو گائے کھاؤں، میں تو صرف یہ کہتا ہوں تمہارے اپنے بھائی بھی تو ہیں۔"

"کہاں ہیں" اچلا بولی۔ "ایک کلکتہ میں رہتا ہے دوسرا بجواڑہ میں۔"

پچھواڑے میں بھائی کا ہونا ضروری ہے۔"

"ہاں ضروری ہے۔" اچی نے سر کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی تم ہو تم سے پوچھنے والا۔"

رام گدگری پھر نہ سمجھا۔ بڑی مرگھلی سی آواز میں اس نے کہا۔ "تمہاری مرضی لیکن میں تو سمجھتا ہوں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

تمہیں مونچھیں رکھنے کی ضرورت بھی ہے؟
مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد سومترا چلی آئی۔
سومترا پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے کی بھی صحت پہلے سے اچھی تھی۔

وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ سیکھ آیا تھا جنہیں جا اور بے جا طور پر استعمال کرتا رہتا تھا۔ سومترا بار بار اسے پکڑ کر کہتی "ڈیڈی کو یہ سناؤ، ڈیڈی کو وہ سناؤ" لیکن وہ بدمعاش وہی رٹتے ہوئے فقرے دہراتا، بعد میں پتا چلا کہ وہ کشمیری زبان کی گندی گالیاں تھیں۔

موہن جام نے اچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سومترا سے اچلا کی ملاقات کرانے سے بہت پہلے اس نے کہہ دیا تھا۔ اس نے ایک بہن بنائی ہے۔

سومترا سنتی رہی، اسے اپنے موہن پہ پورا بھروسہ تھا۔ نہیں وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے لاابالی پن سے محبت کرتی ہیں اور یا ان کی صحت اس درجہ خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں موت پر ترجیح دیتے ہوئے کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں "جھک مارتے ہیں تو مارتے پھریں۔" اور پھر بھگوان کو جواب انہیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا۔"

آخر رات کو چپکے میں ایسی آوازیں روتی ہیں جو انہیں خود بھی سنائی نہیں دیتیں۔

سومترا نے کہا بھی تو صرف اتنا "ضرورت کیا تھی۔ تمہاری اپنی بہن جو ہے

اس پر نچھاور کر دو اپنا پیار" یا "ایسی ہی کوئی پیار کی باڑھ آئی ہے۔

"ہاں۔ موہن نے قدرے درشتی سے کہا۔

سومترا دب گئی۔ صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو، اس نے جواب کے انداز میں سوال کیا "رادھا کیسی ہے؟"

"میں تو اس سے ملا نہیں۔"

"ہائے رام! جب سے میں گئی ہوں اپنی بہن سے نہیں ملے"؟

"وقت نہیں ملا۔"

"اور وہ خود بھی آئے ہیں؟ ... رادھا اور کیلاش پتی"؟

آئے تھے تین چار بار ... لیکن میں ہی گھر پہ نہ تھا۔"

سومترا کہنا چاہتی تھی، ملتے بھی کیسے، وہ تو سگی بہن تھی، بنائی ہوئی تھوڑے تھی لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی۔

اور پھر موہن جام نے جو کہہ دیا "پوہیں کو رکھشا کا تہوار ہے، جاؤں گا اور مل آؤں گا۔"

رکھشا کے دن موہن جام پاریل اپنی بہن رادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سومترا بھی تھی۔ رادھا یوں پر پھیلائے لپکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہو ... اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتا تھا اس نے رادھا کو گال سے چوم لیا۔ پھر سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر بہن کی آنکھوں سے شکایت کے آنسو پونچھے۔

کچھ دیر کے بعد رادھا بڑے مزے سے اٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے

مٹھائی کی طشتری اٹھالی۔ پھر چوکی سامنے رکھ کر بھائی کو بیٹھایا۔ اس کا منہ پورب کی طرف کیا۔ راجو، موہن کا بچہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اشٹمی کا لینکڑا۔۔۔

"ارے" رادھا نے راجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پہلے تو راکھی بندھوائے گا۔؟

"ہاں"۔ راجو نے گھڑاسا سر ہلا دیا۔

"پہلے تو میں اپنے بھائی کے باندھوں گی۔"

"نہیں پہلے میرے باندھو۔"

ایسا ہی حکم چلاتا ہے" رادھا پیار سے بولی "تو بھگوان سے کہہ تجھے بھی ایک بہن لا دیں چھوٹی سی۔ جو ہر سال راکھی باندھا کرے۔"

اور ایسا کہنے میں راجو، موہن اور کیلاش پتی تینوں نے سومترا کی طرف دیکھا جس نے شرما کر منہ ساری میں چھپا لیا۔

رادھا نے موہن بھیا کی کلائی پہ سادہ سی مولی کی راکھی باندھی، منہ میں میٹھے کا ایک ٹکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ رادھا نے دس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پرارتھنا کی یہ دن ہر بہن کے لیے آئے بھگوان۔ اور اس کی آنکھوں میں پیار کی نمی تھی۔

سومترا اور بچے کو گھر چھوڑ کر موہن جام اپلا کے ہاں جانے کے لیے نکلا وہ سومترا کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس روز نہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ عورتیں کئی باتوں میں مردوں کو خواہ مخواہ روکتی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو،

وہ نہ کرو۔ جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اسی طرح مردوں کی عورتوں کے پلے نہیں پڑتیں۔

موہن بازار میں کپڑے کی ایک دکان پہ گیا۔ بہت کچھ الٹ سلٹ کے بعد ایک بنارسی ساری ملی جس پہ ہلکی ہلکی زردوزی کی گئی تھی۔ اس کی قیمت سوا تین سو روپے طے ہوئی۔ موہن نے پیسے دیئے، ساری کو ایک خوبصورت سے گفٹ پیپر میں بندھوایا اور سکارزدے پر سہنہ سدن کے لیے چل نکلا۔

اچلا اپنے گھر میں بیٹھی قینچی ہاتھ میں لیے کچھ کتر بیونت کر رہی تھی جو صبح سے ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ رام گدکری کھڑکی میں کھڑا یوں ہی بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور نیچے ٹیلر ماسٹر کی دکان پہ آتے جاتے ہر آدمی کے سر پہ اپنے سگریٹ کا گل جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبھی سامنے موہن جام کی کار آکر رکی پیچھے ہٹتے ہوئے رام گدکری نے آواز دی "اچی"۔

"جی" اچی نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔

"وہ آیا ہے"۔

"کون وہ؟ بھیا جی۔"

"بھیا جی نہیں، مچلا۔"

"مچلا؟"

"ہاں۔ تو اچلا ہے نا۔ اور وہ مچلا۔"

جب تک موہن دروازے پہ آچکا تھا اور گھنٹی بجا چکا تھا، رودزی

رام گدکری کا خیال تھا موہن اس دن نہیں آئے گا۔۔۔ اگر وہ رکھشا بندھن کے لئے آ گیا تو پھر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔ پھر تو۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ اور موہن آ گیا تھا جس کے لیے اچلا صبح ہی سے کلابتون اور جھل مل اور نہ جانے کن کن چیزوں کی ایک خوبصورت راکھی بناتی رہی تھی، رادھا کی غریبانہ، مولی کے دھاگے کی راکھی تو موہن نے اتار کر کہیں پھینک دی تھی اور بھاگ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی، اور اس کی یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی کسی راجہ کی کرتا ہے۔

رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا،

تھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورب کی طرف منہ کئے پیڑھی پہ بیٹھا تھا، اور رام گدکری کچھ پرے بے اعتنائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا،

جبھی اچلا آئی۔ اس نے ایک بہت خوبصورت قمیض اور شلوار پہنی ہوئی تھی، گلے میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک دوپٹہ تھا جس نے اچلا کے گلے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ رفٹ سی قمیض نے چھاتی، کمر اور نچلے حصے کی بہت ہی خوبصورت حدبندیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں رکھی ہوئی مٹھائی پہ سونے کے ورق کانپ رہے تھے، اور اس کے ایک طرف راکھی تھی جس کی جھل مل میں کچھ سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے،

موہن نے بڑی محبت سے ہاتھ بڑھایا اچلا نے جب موہن کی کلائی پہ راکھی باندھنا شروع کی تو رام گدکری کو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپتے ہوئے دکھائی دیئے، پھر موہن نے گفٹ پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی اس پہ سنہ

روپے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزیں اچلا کی طرف بڑھا دیں۔

رام گدکری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے پھیلیں اور پھر معمول کی سی ہو گئیں۔

رکھشا کی یہ رسم ادا کرنے میں اچلا بھی خاموش تھی، اور موہن بھی، دونوں کے بدن میں ایکا ایکی کہیں ہاتھ چھو جانے سے ایک بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ پھر اچلا نے دھیمی سی آواز میں کہا "یہ دن بار بار آئے بھگوان۔ اور جب موہن نے اچلا کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں حیا کی سرخی تھی۔

کچھ دیر یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گدکری سے ہاتھ ملایا، اچلا سے نمستے کی اور چل دیا، دروازے کی طرف بڑھتے ہوتے اس نے ایک آہ بھری جیسے کسی نے نہ دیکھا، پھر وہ پیچھے چھوڑنے کے لئے جانا چاہتی تھی لیکن آج اس کے پیر جیسے دبے گئے تھے۔

"تمہیں خوش ہونا چاہیے اچی" رام نے کہا "بھائی کو راکھی باندھی ہے"

"ہاں" اچی نے کہا "آج صبح ہی سے میری طبعیت کچھ۔۔۔۔"

"صبح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو۔ سب اکٹھا کرتی رہی ہو۔

اچلا نے سر ہلا دیا۔۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا "میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی دی ہو ساری پہن کر مجھے دکھاؤ گی۔

اچی نے جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گدکری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا "کیا ہو گیا میری اچو کو"

"کچھ نہیں" اچو نے ایک دھیمی سی آواز میں کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد

ڈالتے ہوئے بولی "مجھ سے پیار کرو"۔

رام نے اچی کو سینے سے لپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔

"اوہ۔۔۔" اچی نے کہا۔

اس کے بعد اچی کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا جب تک موہن جام اچلا اور رام گڈکری کے خیالوں سے کہیں پرے جا چکا تھا۔

٭ ٭ ٭

ختم شد

خوشنویس۔۔۔۔ محمد ارشد چٹھہ چوپالوی۔

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل)	قرۃ العین حیدر	پاگل	خلیل جبران
" " " (حصہ دوم)	" " "	محبت اور جوانی	" "
آگ کا دریا	" " "	ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	" " "	پھول کی تنہائی	" "
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	الٹا درخت	" "
پطرس کے خطوط	" "	محبت کی رات	" "
زیرِ لب	صفیہ اختر	مضامین کرشن چندر	" "
حرفِ آشنا	"	لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
گنجے فرشتے	منٹو	نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
انارکلی	"	کلیاتِ جگر	جگر مرادآبادی
ٹھنڈا گوشت	"	آتشِ گل	" "
کرنیں	شفیق الرحمٰن	کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	تلخیاں	" "
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی	گلِ نغمہ	
زرد پتے	خلیل جبران		

مکتبۂ اُردو ادب لاہور